وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

جلد: ۵۱
شمارہ: ۶
ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ
جون ۲۰۰۳ء
فی شمارہ ۱۲/-

ادارہ تحریر
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

☆ اندرون ملک	125 روپے
☆ ایشیا' یورپ' افریقہ وغیرہ	800 روپے
☆ امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ	1000 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: 36- کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700' فون: 03-02-5869501
فیکس: 5834000 ای میل: anjuman@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67- گڑھی شاہو' علامہ اقبال روڈ' لاہور
فون: 6316638-6366638 فیکس: 6305110
ای میل: markaz@tanzeem.org

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض احوال

کیا اب بھی وقت نہیں آیا......

اس حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کے لئے اب کسی گہری بصیرت باطنی یا ژرف نگاہی کی ضرورت نہیں ہے کہ پاکستان اس وقت نہ صرف یہ کہ عالمی طور پر نہایت گہری سازشوں کی زد میں ہے بلکہ ایک ایسے ٹریپ میں آچکا ہے جس سے عزت وسلامتی کے ساتھ نکلنے کا بظاہر کوئی راستہ موجود نہیں ہے سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ کی کوئی خصوصی تائید ہماری دستگیری فرمائے۔

موجودالوقت منظر نامہ یہ ہے کہ بھارت جو گزشتہ چھ ماہ سے اپنی پوری جنگی قوت کے ساتھ ہماری مشرقی سرحد پر براجمان ہے اور اس حوالے سے اربوں روپے کا خرچ ماہانہ برداشت کر رہا ہے اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کی خاطر آخری قدم اٹھانے کے لئے پر تول رہا ہے۔ اس نے نہایت عیاری کے ساتھ عالمی رائے عامہ کو یہ باور کرانے میں کامیابی حاصل کرلی ہے کہ کشمیر کے اندر اور بھارت کے طول وعرض میں جو دہشت گردی اور تخریب کاری کے واقعات ہو رہے ہیں ان کا ذمہ دار پاکستان ہے جو دہشت گرد تنظیموں کی سرپرستی سے تاحال باز نہیں آیا۔ لہٰذا اب پاکستان کو سبق سکھائے بغیر چارہ کار نہیں۔ حالانکہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ تخریب کاری و دہشت گردی کے جن واقعات کے حوالے سے بھارت واویلا مچا رہا ہے ان کی حیثیت بھارتی ایجنسیوں کے اپنے ترتیب دیئے ہوئے ڈراموں سے زیادہ نہیں۔ لیکن عالمی رائے عامہ چونکہ بوجوہ اسلام اور مسلمان دشمنی کے بخار کی لپیٹ میں ہے لہٰذا اس کی یرقان زدہ نگاہیں وہی کچھ دیکھنا اور سننا پسند کرتی ہیں جو بھارت انہیں دکھانا اور پڑھانا چاہتا ہے۔ پاکستان لاکھ اپنی صفائی پیش کرے اور اپنے مؤقف کے حق میں دلائل کے خواہ کیسے ہی انبار لگائے' کوئی اس کی بات سننے کو تیار نہیں ـــــ بھارتی حکومت کی کامیاب حکمت عملی کے باعث نہ صرف یہ کہ عالمی رائے عامہ اس کے حق میں ہموار ہو چکی ہے بلکہ اندرون ملک اپوزیشن سمیت تمام طبقات بھی پاکستان کے خلاف اقدام میں بھارتی حکومت کے ہمنوا ہیں۔

امریکہ' جس کی خوشنودی کے حصول کی خاطر صدر پرویز مشرف نے نہ صرف اپنی افغان پالیسی کو بلکہ افغان بھائیوں اور بالخصوص امارتِ اسلامی افغانستان کو اپنے ہاتھ سے ذبح کرنا گوارا کیا' آج ہماری ساری ''وفاؤں'' کو بھلا کر پوری ڈھٹائی کے ساتھ ہمارے ازلی دشمن بھارت کی بھرپور پشت پناہی کر رہا ہے۔ چنانچہ اب وہ تمام اندیشے اور خدشات ایک حقیقت بن کر ہماری نگاہوں کے سامنے آگئے ہیں جن کا اظہار فراست مومنانہ رکھنے والے دینی رہنماؤں نے ۱۱ ستمبر کے بعد حکومتی پالیسی سے اختلاف کرتے ہوئے کیا تھا کہ پاکستان کے جن مفادات کے تحفظ کی خاطر صدر مشرف نے اسلام کے دشمنوں کا اتحادی بننا اور اللہ کے غضب کو دعوت دینا قبول کیا ہے' وہ آج نہیں تو کل' اسی امریکہ کے ہاتھوں پامال ہو کر رہیں گے جس کی خاطر ہم نے اپنی مسلمانی کو داؤ پر لگایا ہے ـــــ چنانچہ آج کون نہیں جانتا کہ بھارت کا یہ جنگی دباؤ اور پاکستان کے خلاف اس کی تمام تر سازشیں نہ صرف امریکہ کے ایماء پر ہو رہی ہیں بلکہ یہ سب کچھ فی

الحقیقت امریکہ' اسرائیل اور بھارت پر مشتمل شیطانی مثلث کی مشترکہ سازشوں اور منصوبہ بندی کا شاخسانہ ہے' جس کا اصل ہدف افغانستان میں امارت اسلامی کے خاتمے کے بعد پاکستان کے جہادی گروپوں پر پابندی' جہاد کشمیر کا خاتمہ' دینی جماعتوں کو غیر موثر بنانے کی خاطر جہادی روح کو کچلنے کا سامان کرنا' اسلامی بنیاد پرستی کو یہاں سے کھرچ کر مادر پدر آزاد معاشرت اور سیکولرازم کا فروغ اور آخری لیکن نہایت اہم ہدف یہ کہ پاکستان کو ایٹمی صلاحیت سے محروم کرنا اور اس کی ایٹمی تنصیبات پر قبضہ کرنا ہے۔

مشرف حکومت کے ذریعے اپنے اکثر اہداف بہت حد تک کامیابی کے ساتھ حاصل کرنے کے بعد اس شیطانی مثلث کا اصل ہدف اب پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر قبضہ یا ان کی تباہی ہے' جس کے لئے سٹیج بڑی عیاری اور کامیابی کے ساتھ سیٹ کیا گیا ہے۔ اسلام دشمن مثلث کی حکمت عملی کچھ یوں محسوس ہوتی ہے کہ کشمیر میں دہشت گردوں کے خاتمے کے بہانے بھارت آزاد کشمیر پر حملہ کرے گا جس کے ردعمل کے طور پر پاکستان جوابی کارروائی پر مجبور ہوگا' لیکن اس سے قبل کہ پاکستان ایٹمی حملے کے بارے میں سوچے' امریکہ اس بہانے پاکستان کی ایٹمی تنصیبات کو ناکارہ بنادے گا کہ خطے میں ایٹمی جنگ کو روکنے کے لئے یہ اقدام ناگزیر تھا۔ واضح رہے کہ امریکہ نے چھ ماہ قبل اپنی اس پالیسی کا اعلان کر دیا تھا کہ اگر پاکستان کے اندر مشرف حکومت کے خلاف کوئی زوردار تحریک چلی تو اس اندیشے کے تحت کہ یہاں کی ایٹمی صلاحیت بنیاد پرستوں اور ''دہشت گردوں'' کے ہاتھ نہ لگ جائے' امریکہ فوری طور پر پاکستان کی ایٹمی تنصیبات پر قبضہ کر لے گا۔ اس کارروائی کے لئے ضروری انتظام امریکہ نے چھ ماہ پہلے سے کر رکھا ہے ـــــ پاک بھارت متوقع جنگ اگر پورے خطے میں پھیل گئی تو جو تباہی وہلاکت برپا ہوگی اس کے تصور سے بھی لرزہ طاری ہوتا ہے' کہ ہندو جنونیوں کے اسلام دشمن انتقامی جذبات کا اندازہ احمد آباد' گجرات کے حالیہ فسادات سے بآسانی لگایا جاسکتا ہے ـــــ لیکن اگر یہ جنگ توقع کے مطابق کشمیر تک محدود رہی تب بھی خاکم بدہن اس بات کا شدید اندیشہ موجود ہے کہ پاکستان' آزاد کشمیر اور اپنی ایٹمی تنصیبات دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ ہم اپنی ''حکیمانہ پالیسی'' کی بدولت سو پیاز تو کھا چکے ہیں' قوی اندیشہ ہے کہ سو جوتے بھی ہمارا مقدر بننے والے ہیں۔ اللہ کے غضب کو دعوت دینے' اس کے دین سے غداری کرنے اور اس کے احکام کو پاؤں تلے روندنے کا بھیانک انجام شاید اب ہمارے سروں پر مسلط ہو چکا ہے۔

تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن ‫ ‬ پیران کلیسا کی دعا ہے کہ یہ ٹل جائے!

عالمی طاقتیں تو ہمیں مٹانے کے درپے ہیں لیکن کائنات کی عظیم ترین قوت اب بھی ہماری دستگیری فرما سکتی ہے' بشرطیکہ ہم قوم یونسؑ کی مانند اجتماعی توبہ کریں' اللہ اور اس کے دین سے وفاداری کا عہد کریں اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا عزم مصمم کرتے ہوئے اس ملک میں دین حق کے قیام اور نظام خلافت کے احیاء کے لئے سرگرم عمل ہو جائیں۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم امریکہ اور عالمی مالیاتی استعمار کی غلامی چھوڑ کر ایک اللہ کی غلامی اختیار کریں اور اجتماعی توبہ کے ذریعے اس کے دامن رحمت کو تھام لیں ـــــ اللہ کی نصرت وتائید کے حصول کا یقینی راستہ یہ ہے کہ ہم اس کے کلمہ کی سربلندی اور دین کے قیام کے لئے سردھڑ کی بازی لگادیں ـــــ ہمارے لئے نجات کی یہی ایک راہ ہے۔ **اللھم وفقنا لھذا (آمین)**

قرآن اور سنّت کا باہمی تعلق

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

قرآن اکیڈمی کراچی میں ۱۲ر دسمبر ۱۹۹۹ء کا خطاب

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اَعُوذ باللّٰہ مِنَ الشّیطٰنِ الرّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿ لَا تُحَرِّکْ بِهٖ لِسَانَکَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۞ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۞ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۞ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ ۞﴾ (القیامۃ: ۱۶ ـ ۱۹)

﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ ۞﴾ (النحل: ٤٤)

﴿ لَمْ یَکُنِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْکِتٰبِ وَالْمُشْرِکِیْنَ مُنْفَکِّیْنَ حَتّٰی تَاْتِیَهُمُ الْبَیِّنَةُ ۞ رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ یَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۞ فِیْهَا کُتُبٌ قَیِّمَةٌ ۞﴾ (البینۃ: ۱ ـ ۳) ...... صَدَقَ اللّٰهُ الْعَظِیْمُ

ادعیہ ماثورہ کے بعد فرمایا:

معزز حاضرین و محترم خواتین! میری گفتگو کا عنوان ''قرآن اور سنّت کا باہمی تعلق'' ہے۔ سنّت رسول ﷺ کا علم ہمیں دو ذرائع سے حاصل ہوتا ہے' جن میں سے پہلا تواتر اُمت ہے' یعنی حضور ﷺ نے جو عمل کیا اسے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے اختیار کیا اور اُمت میں تواتر سے چلا آ رہا ہے۔ جیسے آپؐ نے نماز پڑھی تو اس کے بارے میں فرمایا: ((صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ)) ''جیسے تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو ویسے ہی نماز پڑھو''۔ آپ کو کسی حدیث میں نماز کا مکمل طریقہ تفصیل سے نہیں ملے گا۔ یہ اصل میں حضور ﷺ کو دیکھ کر منتقل ہوا ہے۔ آپؐ کو دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے نماز پڑھی' صحابہ کرامؓ کو دیکھ کر تابعین کرامؒ نے پڑھی' پھر ان کو دیکھ کر تبع

تابعین نے پڑھی۔ نسلاً بعد نسلٍ یہ اُمت کا تواترِ عمل ہے جس کے ذریعے سے سنّت رسولؐ کا بہت بڑا ذخیرہ ہمیں میسر آیا۔ اور یہ زیادہ بنیادی ذریعہ (Primary Source) ہے اور یہی وہ ذریعہ ہے جس کے بارے میں ہمیں یقین ہے کہ اس میں کوئی وقفہ نہیں ہے۔ صحابہؓ تو نام ہی ان لوگوں کا ہے جنہوں نے حضور ﷺ کی صحبت سے فیض اٹھایا اور حضور ﷺ کو دیکھا' اور تابعین تو کہتے ہی ان کو ہیں جنہوں نے صحابہ کرامؓ کی صحبت اختیار کی اور اُن کو دیکھا۔ لہٰذا یہاں کوئی وقفہ اور کوئی خلا نہیں ہے۔

سنّت رسولؐ کو جاننے کا ذریعہ سنّت رسولؐ کا تحریری ریکارڈ ہے' جسے ہم حدیث کہتے ہیں۔ البتہ اس کے بارے میں کچھ لوگوں کو شکوک وشبہات پیدا کرنے کا موقع مل جاتا ہے کہ یہ حدیثیں رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تو نہیں لکھی گئیں' بلکہ واقعہ یہ ہے کہ حضور ﷺ نے تو اپنے زمانے میں اس سے منع بھی کر دیا تھا اور فرمایا تھا: ((لَا تَکْتُبُوْا عَنِّیْ غَیْرَ الْقُرْآنِ)) یعنی میری طرف سے صرف قرآن لکھو' اور کوئی شے نہ لکھو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت معدودے چند لوگ ہی لکھے پڑھے تھے۔ اگر وہ قرآن بھی لکھتے اور حدیث بھی تحریر کرتے تو یہ چیزیں باہم گڈمڈ ہو جاتیں۔ سابقہ آسمانی کتابوں میں یہی تو ہوا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت چار انجیلیں مانی جاتی ہیں۔ ویسے تو ایک سو چار انجیلیں ہیں' لیکن سو کو غیر قانونی' غیر مصدقہ اور غیر مستند قرار دیا گیا ہے' جبکہ چار Gospels عیسائیوں کے نزدیک مصدقہ اور مستند ہیں۔ یہ ہیں: متی کی انجیل' یوحنا کی انجیل' مرقس کی انجیل اور لوقا کی انجیل۔ لیکن ان انجیلوں میں اللہ کا کلام جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا وہ بھی ہے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سیرت بھی ان ہی میں لکھی ہوئی ہے' سولی دیئے جانے (ان کے خیال میں) کے بعد کے واقعات بھی اس میں درج ہیں' حالانکہ یہ تو سیرت کے واقعات ہیں' ان کے حضرت مسیح پر نازل ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' پھر اس میں حضرت مسیح علیہ السلام کے اپنے مواعظ بھی شامل ہیں۔ اس طرح ان میں یہ ساری چیزیں گڈمڈ ہو گئی ہیں۔

اُمت مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہوا ہے کہ قرآن حکیم کے متن کے ساتھ کسی

دوسری چیز کی آمیزش نہیں ہوئی۔ اسلام آخری دین ہے' اُمت مسلمہ آخری اُمت ہے' حضور ﷺ نے فرمایا: ((اَنَا آخِرُ الْمُرْسَلِيْنَ وَاَنْتُمْ آخِرُ الْاُمَمِ)) "میں آخری رسول ہوں اور تم آخری اُمت ہو"۔ اب یہ دین تو تا قیامِ قیامت رہے گا۔ اس کی حفاظت کا اللہ نے جو بندوبست کیا ہے اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ لے لیا کہ نہ اس کے متن (Text) میں کوئی تبدیلی ہوگی اور نہ کوئی شے اس میں شامل ہوگی۔ یعنی غیر قرآن قرآن میں داخل نہیں ہوگا اور قرآن کا کوئی حصّہ قرآن سے باہر نہیں رہے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر: ۹)

چنانچہ نزولِ قرآن کے وقت گویا اللہ تعالیٰ کی راہنمائی میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ ابھی صرف قرآن مجید لکھو' حدیثیں مت لکھو' البتہ جب قرآن کی تدوین مکمل ہوگئی تو اس کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے احادیث نبویؐ بھی تحریر کیں۔

قرآن حکیم کی جمع وتدوین

یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ حدیث کے بارے میں جو لوگ شوشے چھوڑتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن تو جیسا کہ آج ہمارے پاس مجلد موجود ہے اسی شکل میں حضور ﷺ نے ہمیں دیا تھا۔ حالانکہ ایسی بات تو نہیں ہے' قرآن بھی جمع ہوا ہے اور اس کی مرحلہ وار تدوین ہوئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں قرآن حکیم کا کوئی ایک نسخہ بھی جمع شدہ موجود نہیں تھا۔ کچھ اوراق کسی کے پاس تھے' کچھ کسی کے پاس۔ کہیں اونٹ کی ہڈیوں خاص طور پر شانے کی ہڈی' جو کہ تختی کی شکل کی ہوتی ہے' اس کے اوپر لکھا ہوا تھا تو کہیں کپڑے پر لکھا ہوا تھا۔ اصلاً تو قرآن لوگوں کے سینوں اور ذہنوں میں محفوظ تھا۔ لیکن اس کی ترتیب اور تدوین حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ہوئی اور یہ ''مابین الدُّفتین'' یعنی دوگتوں کے مابین مجلد صورت میں جمع کیا گیا۔ اس کی ضرورت بھی اس لئے محسوس ہوئی کہ جنگ یمامہ میں کئی سو حفاظ شہید ہوئے تو اندیشہ ہوا کہ اگر حفاظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو قرآن کہیں غائب نہ ہو جائے۔ لہٰذا اس کو کتابی

شکل میں لایا گیا۔ پھر یہ کہ ہر قبیلے کو یہ رعایت حاصل تھی کہ وہ اپنے لہجے میں قرآن پڑھ سکتا تھا۔ ظاہر بات ہے پورے عرب کا ایک لہجہ تو نہیں تھا' قریش کا اپنا لہجہ تھا اور دوسرے قبائل کے اپنے لہجے تھے اور سب کو ایک قراءت پر جمع کر دینا آسان کام نہیں تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ پنجاب کے دیہات میں ''چاقو'' کو ''کاچو'' کہا جاتا ہے۔ آپ کسی دیہاتی کا کتنا ہی تلفظ درست کر دیں مگر وہ اسے ''کاچو'' ہی کہے گا۔ مجھے اپنے بچپن کا واقعہ یاد ہے کہ میرا پانچویں جماعت کا ایک کلاس فیلو ''پنسِل'' نہیں کہہ پا رہا تھا' کیونکہ ان کے گھر میں ''پِنْسَل'' کہا جاتا تھا۔ ہمارے ایک سکھ ماسٹر نے اس پر اسے بہت مارا مگر پھر بھی اس کا تلفظ درست نہیں ہوا۔

نبی اکرم ﷺ کے دَور میں قرآن مجید کو مختلف لہجوں میں پڑھنے کی اجازت تھی' لیکن پھر یہ ہوا کہ اسے لکھا بھی مختلف لہجوں کے مطابق جانے لگا۔ چنانچہ اب اندیشہ ہوا کہ اس طرح تو قرآن کے متن (text) جدا ہو جائیں گے۔ لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اُمت کو ایک رسم الخط پر جمع کیا گیا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ جو کہا جاتا ہے کہ ''جامع آیاتِ القرآن'' یہ مغالطہ ہے۔ یہ صرف ردیف اور قافیہ ملانے کے لئے ہمارے ہاں جمعہ کے خطبے میں یہ الفاظ کہہ دیئے جاتے ہیں جو کہ مغالطہ آمیز ہیں۔ ''جامع آیات القرآن'' کا مطلب تو یہ ہوا کہ قرآنی آیات کو جمع کرنے والے۔ حالانکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا دَورِ خلافت رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بارہ برس بعد شروع ہوتا ہے۔ پہلے تقریباً اڑھائی برس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دَورِ خلافت رہا' پھر دس برس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہیں' اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بھی کچھ سال لگا لیجئے جن کے بعد یہ کام شروع ہوا ہو گا۔ تو اس طرح پندرہ برس بعد جا کر یہ کام ہوا؟ اگر یہ مان لیا جائے تو اعتراض کرنے والوں کو یہ موقع مل جائے گا کہ ان پندرہ برسوں میں تو کافی قرآن ضائع ہو گیا ہو گا۔ نہیں! جامع آیات القرآن تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے تمام آیات کو جمع کیا اور ان کا دَورِ حکومت تو صرف اڑھائی برس پر محیط ہے۔ گویا کہ

حضور ﷺ کے وصال کے ڈیڑھ سال بعد قرآن جمع کر دیا گیا تھا۔

اس کے بعد جو رسم الخط میں فرق آ رہا تھا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پوری اُمت کو ایک رسم الخط پر جمع کیا جو کہ رسم عثمانی کہلاتا ہے۔ اب کتابت مصاحف میں رسم عثمانی کی پابندی ضروری ہے۔ مثلاً لفظ ''مَـالِک'' عربی میں دو طرح سے لکھا جا سکتا ہے: مَالِکِ اور مٰلِکِ۔ لیکن قرآن حکیم کے ضمن میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جس طور سے اُمت کو جمع کر دیا اب اسی طریقے پر لکھنا ہو گا' یعنی ''مٰـلِکِ یَــوْمِ الدِّیْنِ''۔ ''م'' پر کھڑی زبر کے ساتھ ''مٰلِکِ'' لکھا جائے گا' ''مَالِکِ'' لکھیں گے تو یہ رسم عثمانی کے خلاف ہو جائے گا۔ اس حوالے سے میں نے صرف یہ وضاحت کی ہے کہ قرآن مجید کی ترتیب و تدوین میں بھی کچھ وقت لگا ہے۔

احادیث نبویؐ کی جمع و تدوین

اسی طرح حدیث کی ترتیب و تدوین بھی ہوئی ہے جس میں کچھ زیادہ وقت لگ گیا۔ ویسے تو صحابہ رضوان اللہ علیہم میں سے بعض کے پاس احادیث کے صحیفے لکھے ہوئے موجود تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی حدیثیں' جن میں زکوٰۃ کے احکام بیان ہوئے ہیں' اپنی تلوار کی نیام میں تلوار کے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ بعض دیگر صحابہؓ کے پاس بھی اپنے لکھے ہوئے صحیفے موجود تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہ کرامؓ احادیث کو لکھا بھی کرتے تھے۔ لیکن صحابہؓ نے حدیث کی تدوین نہیں کی۔ اس لئے کہ صحابہ تو دین کو پوری دنیا پر غالب کرنے کے لئے دنیا بھر میں منتشر ہو گئے تھے' مدینہ میں بیٹھے تو نہیں رہے تھے' سب کے سب فوجوں میں شامل ہو کر جہاد و قتال میں مصروف تھے۔ اس اثناء میں کوئی کوفے میں آ کر آباد ہو گیا تو کوئی بصرہ میں' اور کوئی کہیں اور آباد ہو گیا۔ پھر جب محدثین نے حدیثوں کو جمع کیا تو بڑے دُور دراز کے سفر کئے۔ وہ کوفے' دِمشق' بغداد وغیرہ گئے۔ لہٰذا جمع و تدوین حدیث میں کچھ وقت لگا ہے۔

جہاں تک سنّت نبویؐ کا تعلق ہے' اس میں کوئی وقفہ نہیں ہے' سنّت متصل ہے۔

یعنی وہ سنت جو ہمیں تواترِ عمل سے ملتی ہے وہ تو متصل ہے۔ صحابہؓ نے حضور ﷺ کو دیکھا اور اس کے مطابق عمل کیا' تابعینؒ نے صحابہؓ کے عمل کے مطابق عمل کیا اور تبع تابعین نے تابعین کو دیکھا تو اس کے مطابق عمل کیا۔ چنانچہ سنّتِ رسولؐ کا سب سے زیادہ معتبر اور حجم کے لحاظ سے سب سے بڑا حصّہ تواترِ عمل سے منتقل ہوا ہے۔ البتہ اضافی طور پر حدیثِ رسولؐ یعنی فرموداتِ رسولؐ ' فرامینِ رسول اور رسول اللہ ﷺ کے فیصلے وغیرہ ان سب کو محدثین کرام نے مرتب اور مدوّن کیا۔ اس کے مجموعے کو ہم حدیث کہتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا اصل موضوع قرآن وسنّت کا باہمی تعلق ہے۔

ایک خیال یہ بھی ہے کہ حدیث سے مراد رسول اللہ ﷺ کے فرمودات ہیں۔ ہمارے سرمایۂ حدیث میں چھ چیزیں جمع ہیں۔ پہلی تقسیم تو اخبار اور آثار ہیں' پھر اخبار و آثار میں بھی تین تین صورتیں ہیں۔ حضور ﷺ کا قول' عمل یا تقریر' یہ "خبر" ہیں۔ تقریر یہ ہے کہ حضور ﷺ کے سامنے کوئی کام کیا گیا اور حضور ﷺ نے اس سے منع نہیں کیا تو گویا حضور ﷺ کی طرف سے implied sanction ہو گئی' اس لئے کہ اگر دینی اعتبار سے غلط ہوتا تو حضور ﷺ اس سے روک دیتے۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے قول' فعل اور تقریر تینوں کو جمع کریں گے تو اسے ہم "خبر" کہتے ہیں' جبکہ صحابیؓ کا قول' عمل اور تقریر آثار کہلاتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ صحابیؓ نے اپنی بات کو چاہے رسول اللہ ﷺ سے منسوب نہ کیا ہو' لیکن یہ بات انہوں نے حضور ﷺ سے سنی ہو گی یا حضور ﷺ کے کسی دوسرے صحابیؓ سے سنی ہو گی۔ اسی طرح کسی صحابیؓ نے کوئی عمل کیا ہے تو یقیناً انہوں نے حضور ﷺ کو کرتے دیکھا ہو گا یا حضور ﷺ کے سامنے وہ عمل ہوا ہو گا اور حضور ﷺ نے اس سے نہیں روکا ہو گا۔ اس حوالے سے صحابیؓ کا قول' صحابی کا عمل اور صحابی کی تقریر اور حضور ﷺ کا قول' عمل اور تقریر' یہ چھ چیزیں جمع ہو کر حدیث کا مجموعہ بنتا ہے۔ یہ تو تھوڑی سی فنی بات تھی جو میں نے آغاز کے اعتبار سے عرض کر دی۔

دَورِ جدید کے فتنے اور اُن کے اثرات

اب دوسری بات میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہم جس زمانے میں سانس لے

رہے ہیں یہ فتن کا زمانہ ہے۔ ہماری حدیث کی کتابوں میں جو ابواب الفتن ہیں ان کے بارے میں گمان یہی ہے کہ ان میں قیامت کے قریب جو فتنے آنے والے ہیں ان کا ذکر ہے۔ اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ اس ضمن میں سب سے بڑا فتنہ جو آئے گا وہ دجال کا ہے۔ اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی نبی یا کوئی رسول ایسا نہیں گزرا جس نے اپنی اُمت کو دجال کے فتنے سے آگاہ نہ کیا ہو۔ ظاہر بات ہے کہ اگر اب تک اس کا خروج نہیں ہوا تو اب اسی اُمت میں ہوگا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ((اَنَا آخِرُ الْمُرْسَلِیْنَ وَاَنْتُمْ آخِرُ الْاُمَمِ)) لہٰذا حضور ﷺ نے ہمیں اس کے فتنے سے بچنے کا طریقہ بھی بتایا کہ سورۂ کہف کی تلاوت کیا کرو، خاص طور پر اس کی ابتدائی اور آخری آیات تمہیں فتنۂ دجال سے بچانے والی ہیں۔

آج دنیا میں دجل اور فریب چوٹی پر پہنچا ہوا ہے اور دجالی تہذیب کا ظہور ہو چکا ہے۔ مادہ پرستانہ دور، فکر، تہذیب، تمدن، یہی درحقیقت دجالی تہذیب ہے۔ اگرچہ ایک شخص بھی دجال ہوگا۔ حدیث میں آتا ہے کہ میری اُمت میں تیس دجال پیدا ہوں گے۔ (ثَلاثُوْنَ دَجَّالُوْنَ کَذَّابُوْنَ) اِن میں نبوت کا دعویٰ کرنے والے بھی ہوں گے۔ لیکن دجال ایک فرد معین بھی ہے جو قیامت کے قریب ظاہر ہوگا، جسے دجال اکبر یا المسیح الدجال کہتے ہیں۔ تاہم دجالی فتنے کے دور میں تو ہم سانس لے رہے ہیں۔ آج سے دو سو سال پہلے سائنس کی جو ترقی شروع ہوئی اور مادے کے اندر جو خاصیتیں اللہ نے پیدا کر دی تھیں ان خواص کا انسان کو علم ہوا اور اس میں اللہ نے جو قوتیں رکھی ہوئی ہیں، مثلاً کشش ثقل کی قوت اور ایٹمی قوت وغیرہ، انسان ان سے متعارف ہوا اور انسان کو قوانین طبیعیہ کا علم حاصل ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ دس ہزار سال میں اتنا بڑا دھماکہ نہیں ہوا تھا جتنا بڑا دھماکہ پچھلے سوڈیڑھ سو برس میں ہوا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مادی علوم، مادہ پرستی اور مادی تہذیب کا ذہنوں پر رعب قائم ہو گیا اور اس تہذیب کا استیلاء اور غلبہ قائم ہو گیا کہ اصل شے تو یہ ہے، اصل مطالعہ کے قابل تو یہ علوم ہیں، اصل حقیقت تو یہ ہے، ہم کیا ذات وصفاتِ باری تعالیٰ کے چکروں میں پڑے رہے! کن

مسائل میں الجھے رہے کہ کتنے ڈھیلوں سے استنجا پورا ہوتا ہے! ہم کہاں ان مسائل میں لگے رہے کہ کہاں وضو ہوتا ہے کیسے ٹوٹتا ہے! یہ کیا مسائل ہیں؟ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی' چاند پر انسان کے قدم پہنچ گئے۔ یہ جو سائنس کی مرعوبیت ہے اس نے مادہ پرستی کی ذہنیت پیدا کی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ماڈرن فزکس کا باوا آدم نیوٹن تھا۔ چنانچہ مائیکل ہارٹ نے ''The Hundred'' کے نام سے جو کتاب لکھی' یعنی ''انسانی تہذیب اور انسانی تاریخ پر اثر انداز ہونے والی سو شخصیتیں'' جنہوں نے انسانی تاریخ کا رخ موڑا ہے' ان میں درجہ بندی کرتے ہوئے وہ نمبر ایک پر محمد رسول اللہ ﷺ کو لایا ہے۔ یہ تو یوں سمجھئے کہ ''آفتاب آمد دلیل آفتاب!'' اس کا انکار تو کوئی اندھا ہی ضد اور تعصب میں آ کر کر سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ نمبر دو پر نیوٹن کو لایا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسانی فکر' تہذیب و تمدن' انسانی سوچ اور انسانی اقدار پر جس قدر گہرا اثر سائنس کا ہوا ہے' اس سے زیادہ اثر تو صرف محمد رسول اللہ ﷺ کا ہوا ہے۔ حالانکہ مائیکل ہارٹ عیسائی ہے' پھر بھی وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو نمبر تین' یعنی نیوٹن کے بعد لایا ہے۔

درحقیقت جب یہ فزکس شروع ہوئی تو ہمارے ہاں اس سے شدید مرعوبیت پیدا ہوئی۔ اس لئے کہ سائنس ہمارے ہاں انگریز فاتح کے ذریعے آئی تھی' اور جو شکست خوردہ ہوتا ہے وہ مرعوب تو ہوتا ہی ہے۔ انگریز فاتح کی صورت میں آیا تو اس کا رعب ہمارے اوپر طاری تھا ہی' اور ساتھ ہی وہ سائنس لے آیا تو ہمارے ہاں کچھ لوگوں نے سمجھا کہ اصل شے تو یہ ہے' ہم خواہ مخواہ کن چیزوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ کچھ لوگوں کا تو یہ انداز تھا کہ ''میرے اسلام کو اب قصہ ماضی سمجھو!'' یہ طرز عمل بہت سے لوگوں کا تھا' چنانچہ بہت سے لوگ دین سے بیزار ہو گئے اور ملحد ہو گئے۔ یہ لوگ ساری چیزیں چھوڑ چھاڑ کر مغربی تہذیب میں سرتاپا غرق ہو گئے۔ کچھ لوگ یہ بھی چاہتے تھے کہ دین سے بھی کچھ نہ کچھ تعلق رہنا چاہئے' کیونکہ آخر آباء و اجداد کی شے ہے۔ ان لوگوں میں ایک طبقہ ایسا اٹھا جس نے یہ طرز عمل اختیار کیا کہ دین کی جو چیز سائنس کے ساتھ ٹکرائے اس کو چھینی لے کر تراش لیا جائے' اس لئے کہ ان کے نزدیک اصل شے تو

سائنس ہی تھی۔ اب اگر کوئی عقیدہ نیوٹونین سائنس کے ساتھ ٹکرا رہا ہوتا تو وہ اس کو ڈھکوسلہ قرار دے کر اس سے اعلانِ براءت کر دیتے۔ مثلاً سائنس نے کہا کہ انسان کی پیدائش مٹی سے ہوئی ہے اور قرآن بھی یہی کہتا ہے تو ٹھیک ہے' یہ بات قابل قبول ہے' لیکن ''جن آگ سے پیدا ہوئے'' یہ کیسے ہو گیا؟ کسی سائنس دان نے جن دیکھا نہیں' سائنس کی رو سے ایسی کسی مخلوق کا وجود ثابت نہیں ہوتا' لہٰذا انہوں نے کہا کہ یہ صرف ہمارا ڈھکوسلہ ہے کہ یہ آگ سے بنی ہوئی مخلوق ہے' بلکہ جن تو اس انسان کو کہہ دیا جاتا ہے جو مشتعل مزاج ہوتا ہے' جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص غصے میں آگ بگولا ہو گیا تو وہ آگ تو نہیں ہو جاتا' یہ تو استعارہ ہے' اسی طرح جن لوگوں میں اشتعال کا مادہ ہے' جو جلدی غصہ میں آ جاتے ہیں انہیں آگ سے بنے ہوئے جن کہہ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح چونکہ فرشتہ سائنس کے دائرے میں نہیں آتا' ہم نہیں جانتے فرشتہ کون ہوتا ہے' لہٰذا فرشتہ کوئی شے نہیں' یہ تو قوائے طبعیہ (Forces of the Nature) کا نام قرآن نے فرشتہ رکھا ہے' ہمارے مولوی خواہ مخواہ اسے کوئی مخلوق سمجھے بیٹھے ہیں۔

اسی طرح اعتقادات اور ایمانیات کے باب میں جو چیز سائنس کے سانچے میں فٹ نہیں بیٹھی اسے تراش لیا گیا تاکہ کوئی ہمیں دقیانوسی نہ کہے کہ یہ جنات اور فرشتوں کو مانتے ہیں! اس لئے کہ سائنس کی رُو سے اصل شے تو وہ ہے جسے انسان دیکھ سکے' چکھ سکے' سونگھ سکے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی بنا پر علم حاصل ہوتا ہے' یہ ہمارے ''Sense organs'' ہیں اور علم تو وہ ہے جو اِن سے حاصل ہو۔ علم تو وہ ہے جو قابل تصدیق (verifiable) ہو۔ سائنس کہتی ہے کہ پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن سے مل کر بنا ہے۔ یہ بات لیبارٹری میں ثابت کی جا سکتی ہے۔ چنانچہ پانی کا hydrolysis کر کے دیکھ لیجئے کہ یہ پانی تھا' اس میں سے کرنٹ گزارا تو یہ دونوں گیسیں علیحدہ ہو گئیں۔ اسی طرح ہائیڈروجن اور آکسیجن کو ملائیں تو پانی بن جائے گا۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ پانی دو گیسوں سے مل کر بنا ہے تو قابل تصدیق (verifiable) ہے جس کو ہم تجرباتی سطح پر ثابت کر سکتے ہیں۔ لیکن دین کی وہ چیزیں جو تجرباتی سطح پر نہیں

آتیں، یعنی قیامت، آخرت، جنت وغیرہ، یہ اسی دنیا کا مستقبل ہیں۔ جو قومیں اسی دنیا کے اندر محنت و کوشش کر کے اپنے ہاں ایک فلاحی معاشرہ اور ویلفیئر سٹیٹ قائم کر لیتی ہیں وہ گویا اپنی جنت بنا لیتی ہیں، قیامت کی شکل میں کوئی نیا عالم وجود میں آنے والا نہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ قیامت کے بعد کوئی نئی دنیا ہو گی اور نئے انسان پیدا ہوں گے۔ یہیں اچھا مستقبل جنت ہے اور بُرا مستقبل جہنم ہے ع

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی!

چنانچہ ہماری جنت بھی یہیں پر ہے اور جہنم بھی۔

سائنس چونکہ مغرب سے آئی تھی لہٰذا ہمارے ہاں سائنس سے مرعوبیت کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب سے مرعوبیت بھی پیدا ہو گئی۔ چنانچہ انگریز اگر کھڑے ہو کر پیشاب کرتا تھا تو اس سے مرعوب ہو کر ہم نے بھی یہ وطیرہ اختیار کیا۔ انگریز کو شیو کرتے ہوئے دیکھ کر ہم نے بھی یہی طریقہ اختیار کر لیا۔ حالانکہ ان باتوں کی کوئی سائنسی توجیہہ نہیں کی جا سکتی۔ غلامانہ ذہنیت کے ساتھ ہم نے مغربی تہذیب کو اپنانا شروع کیا اور اس کے نتیجے میں جو چیز نظر آئی اسے اپنانا شروع کر دیا۔ ہمارے ہاں اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے جبکہ مغرب میں چار شادیاں نہیں کی جاتیں، چنانچہ ہمارے بعض لوگوں نے معذرت خواہانہ انداز میں توجیہہ کی کہ یہ تو صرف یتیموں کی ماؤں سے شادی کرنے کی اجازت دی گئی تھی، یہ کوئی عام حکم نہیں ہے، اس لئے کہ مغربی تہذیب اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ ان کے ہاں ناجائز تعلقات خواہ لاتعداد ہوں، داشتائیں کتنی بھی ہوں، اس پر انہیں کوئی اعتراض نہیں، لیکن شادی اگر ہو گی تو ایک ہی ہو گی۔ اس طرح جو بھی احکامِ شریعت اور تہذیب و تمدن کے معاملات تھے ان میں ہمارے مغرب زدہ دانش وروں نے تیشہ چلانا شروع کر دیا کہ یہ تو خواہ مخواہ مولویوں کے ڈھکوسلے ہیں۔

شریعت کے تفصیلی احکام کا مأخذ

حقیقت یہ ہے کہ شریعت کے جو تفصیلی احکام ہیں وہ احادیث اور سنّت سے معلوم

ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم میں ﴿اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ﴾ ''نماز قائم کرو'' کا حکم کتنی مرتبہ آیا ہے' لیکن نماز کا نظام تو قرآن میں کہیں ہے ہی نہیں۔ پہلے صرف رات کی نماز تھی' پھر دو وقت یعنی صبح و شام کی نماز ہوگئی' پھر تین وقت کی ہوگئی' پھر کہیں نبوت کے گیارھویں سال میں جب واقعۂ معراج پیش آیا تو پانچ وقت کی نماز فرض ہوئی۔ پھر یہ کہ نمازوں کے اوقات قرآن میں کہیں بھی نہیں دیے گئے کہ ظہر کا وقت کب شروع ہوگا اور کب ختم ہوگا' عصر کب شروع ہوگی' کب ختم ہوگی۔ قرآن مجید میں قیام کا ذکر بھی ہے' سجود کا بھی اور رکوع کا بھی ذکر ہے' لیکن یہ ترتیب کہاں مذکور ہے کہ پہلے کھڑے ہونا ہے' پھر رکوع کرنا ہے' پھر کھڑے ہونا ہے' پھر سجدے میں جانا ہے' دو سجدوں کے بعد پھر کھڑے ہونا ہے؟ نماز کی ایک رکعت کی ترتیب بھی قرآن میں موجود نہیں' یہ سارا نظام ہمیں سنّت رسول ﷺ سے ملا ہے۔ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ)) ''نماز اس طرح پڑھو جیسے تم مجھے دیکھتے ہو کہ میں نماز پڑھتا ہوں''۔ لیکن جب حدیث اور سنّت سے صرفِ نظر کیا گیا اور صرف قرآن کے حوالے سے ''نظامِ صلوٰۃ'' مرتب کرنے کی کوشش کی گئی تو عجیب عجیب باتیں سامنے آئیں۔ کسی نے کہا کہ تین وقت کی نماز ہے' پانچ وقت کی تو مولویوں نے خواہ مخواہ بنا لی ہیں۔ کچھ آیات کے حوالے سے انہوں نے تین نمازیں نکال لیں' کسی نے دو نکال لیں۔ کسی نے کہا کہ ''صلوٰۃ'' کو ''نماز'' کے مفہوم میں لینا بڑی حماقت ہے۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کا مطلب تو یہ ہے کہ معاشرہ قائم کرو' نماز کوئی شے نہیں ہے۔ جب میں منٹگمری (ساہیوال) میں تھا تو وہاں ایک میونسپل انجینئر تھے' بہت دیانت دار آدمی تھے اور ان کی شہرت تھی کہ وہ ایک پیسہ رشوت نہیں لیتے اور کوئی کمیشن نہیں لیتے' لیکن وہ پرویزی تھے۔ ان سے ایک روز گفتگو ہو رہی تھی' انہوں نے مجھ سے کہا کہ آپ مجھے قرآن میں ایک مقام ایسا دکھا دیجئے کہ جہاں ''صلاۃ'' کا ترجمہ ''معاشرہ'' نہ ہو سکتا ہو! ایک دفعہ تو میں گھبرا سا گیا کہ ایک معمر شخص مجھ نوجوان سے یہ بات چیلنج کے انداز میں کہہ رہا ہے' لیکن اسی وقت اللہ تعالیٰ نے میری مدد فرمائی اور مجھے ایک دم سورۃ الجمعہ کی اس آیت کا خیال آیا: ﴿فَاِذَا

قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ ''پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ''۔ میں نے اس آیت کا حوالہ دیتے ہوئے ان صاحب سے کہا کہ اب یہاں اگر صلاۃ کا ترجمہ معاشرہ کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ معاشرے کا تیا پانچہ کر کے زمین میں منتشر ہو جاؤ۔ اس پر وہ شخص ہکا بکا اور مبہوت ہو کر رہ گیا اور ﴿فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ﴾ والا نقشہ سامنے آ گیا جو کہ آج بھی مجھے یاد ہے۔

فتنۂ انکارِ حدیث

اس ضمن میں ہمارے ہاں جو فتنے اٹھے ہیں ان میں سب سے بڑا فتنہ ایک اعتبار سے قادیانیت کا فتنہ ہے۔ اس لئے کہ یہاں معاملہ قانون کا ہو جاتا ہے۔ واضح ہو گیا کہ اگر کسی شخص نے غلام احمد قادیانی کو نبی مان لیا تو وہ کافر ہو گیا اور وہ ملت اسلامیہ سے خارج ہے' چاہے وہ کوئی سائنس دان ہو' ہائی کورٹ کا جج ہو' کچھ بھی ہو' وہ غیر مسلم ہی ہے۔ یہ چونکہ قانونی فتنے کی بات تھی تو اس لئے اس فتنے کے خلاف علماء خود کھڑے ہوئے اور انہوں نے کتابیں لکھیں۔ لیکن جہاں تک وسعت کا تعلق ہے فتنۂ انکارِ حدیث اس سے زیادہ بڑا فتنہ ہے۔ اس کے بے شمار گریڈ ہیں۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے تو احادیث کا سرے سے انکار کیا۔ اب قرآن مجید کے الفاظ کی من مانی تفسیر کر کے ڈکشنری نکال کر ان الفاظ کے مادے سے اپنا من پسند مفہوم بنا لیا چاہے حضور ﷺ نے اس کا بالکل دوسرا مفہوم بیان کیا ہو۔

یہ فتنے دو اشخاص کے پیدا کردہ ہیں' ایک غلام احمد قادیانی اور دوسرا غلام احمد پرویز۔ اگرچہ پرویزیت کا فتنہ دراصل سر سید احمد خان سے شروع ہوا ہے۔ وہ نیوٹونین دور جس میں سر سید احمد خان سانس لے رہے تھے' اس میں مرعوبیت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے کہا کہ ''جن'' کا کوئی وجود نہیں ہے' بس مشتعل مزاج لوگوں کو قرآن مجید میں جن کہہ دیا گیا ہے۔ سر سید احمد خان مرحوم کی شخصیت کے دو حصے ذہن میں رکھئے۔ ایک مسلمانوں کا بہی خواہ ہونے کے اعتبار سے ان کا جو کردار ہے میں اس کی بہت عزت

کرتا ہوں اور ان کی میرے دل میں بہت وقعت ہے' لیکن جب وہ مفسر قرآن بن کر سامنے آتے ہیں تو نئی نئی توجیہات کر رہے ہیں' معجزات کا انکار کر رہے ہیں' فرشتوں کا انکار کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ فرشتے تو قوائے طبیعیہ کا نام ہے۔ جب کسی نے کہا کہ قرآن کون لے کر آیا تو جبرائیل کا صاف انکار کیا۔ ذرا ان کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

ز جبریل امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

یعنی "میں کسی جبرائیل کے لائے ہوئے قرآن کو نہیں جانتا۔ میرے پاس جو قرآن ہے یہ تو سارے کا سارا میرے محبوب (محمد ﷺ) کا کلام ہے"۔ یہ بات سر سید احمد نے کہی۔ قائداعظم صرف سیاسی راہنما تھے' انہوں نے کبھی فتوے نہیں دیئے اور نہ ہی کبھی مفسر کے روپ میں سامنے آئے' جبکہ سر سید کا معاملہ یہ تھا کہ وہ فتوے بھی دے رہے ہیں' تفسیر بھی کر رہے ہیں۔ بہرحال پاک و ہند میں فتنۂ انکارِ حدیث کا آغاز سر سید سے ہوا۔ البتہ جہاں تک اسلامی تہذیب و تمدن کا معاملہ تھا تو سر سید احمد خان پکے مسلمان تھے۔ نماز' روزہ کے معاملے میں پکے تھے۔ ان کے ہاں پردے کا تو یہ معاملہ تھا کہ جب گورنر یوپی نے ان سے کہا کہ میری بیگم آپ کی خواتین سے ملنا چاہتی ہے تو صاف کہہ دیا کہ ہماری خواتین کا بھی اس قسم کی خواتین سے پردہ ہے' لہٰذا میری بیوی آپ کی بیگم سے نہیں مل سکتی۔ ان میں یہ ہمت تھی۔ داڑھی تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ کتنی تھی۔ لیکن اعتقادی سطح پر یہ کتر بیونت سر سید ہی سے شروع ہوئی۔

پھر سر سید سے جو شاخیں پھوٹی ہیں تو اس میں کچھ کام علامہ مشرقی نے بھی کیا' لیکن سب سے بڑھ کر اس فتنے کو غلام احمد پرویز نے پروان چڑھایا' کیونکہ وہ اچھا ادیب تھا' اسے انشا پردازی کی مشق تھی اور اچھا مقرر بھی تھا۔ چنانچہ اس نے اس فتنے کو اپنی تحریر و تقریر کے ذریعے سے خوب پھیلایا۔ اور چونکہ وہ گورنمنٹ آف انڈیا میں اونچے عہدے پر تھا اور پاکستان میں بھی ڈپٹی سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوا' تو سرکاری حلقوں میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ لہٰذا انگریزی دان سرکاری طبقے یعنی

CSPs وغیرہ کے طبقے میں اس کا فکر بہت پھیلا ہے' کیونکہ وہ مسلمان رہتے ہوئے مغربی تہذیب بھی اختیار کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جہاں اس مغربی تہذیب کے راستے میں اسلام رکاوٹ ڈالتا تھا تو کہا جاتا کہ یہ مولویوں کے ڈھکوسلے ہیں۔ قرآن مجید کی ایسی ایسی تاویلیں کیں کہ خدا کی پناہ۔ قرآن میں آیا ہے کہ ''چور کے ہاتھ کاٹ دو'' تو اس پر کہا گیا کہ یہ مولوی تو پاگل ہیں جو اس کا لفظی مفہوم مراد لیتے ہیں۔ اس سے مراد تو یہ ہے کہ ایسا معاشرہ قائم کرو کہ کسی کو چوری کی ضرورت ہی نہ ہو' گویا کہ آپ نے چور کے ہاتھ کاٹ دیئے۔ جیسے کوئی شخص اپنے بیٹے سے کہتا ہے کہ بیٹے! تم نے تو میرے ہاتھ کاٹ دیئے' یعنی تم نے ایسا قدم اٹھالیا کہ میں اب کوئی اور کام نہیں کر سکتا' تمہاری مدد نہیں کر سکتا' تم نے تو میرے ہاتھ کاٹ ڈالے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ محاورہ ہے جو قرآن میں آیا ہے: ﴿اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا﴾ حالانکہ ان سے اگلے الفاظ اس کے لفظی مفہوم ہی کو واضح کر رہے ہیں: ﴿جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ﴾ ''یہ بدلہ ہے ان کے کرتوت کا اور سزا ہے اللہ کی طرف سے''۔ لیکن ان کو اس سے کیا بحث ہے۔ سننے والے تو جاہل ہوتے ہیں۔ نہ انہوں نے کبھی عربی پڑھی' نہ کبھی غور کرتے ہیں' وہ تو ان کی تقریر وتحریر سے مرعوب ہوں گے' اب وہ جو کہہ رہے ہیں گویا کہ وہ وحی خداوندی ہے۔

یہ فتنہ اس انداز سے پھیلا ہے اور آج ہمارا تقریباً ہر پڑھا لکھا طبقہ کسی نہ کسی درجے میں اس فتنے میں مبتلا ہے۔ بنوری ٹاؤن سے قریباً چالیس برس پہلے ایک کتاب چھپی تھی جس میں غلام احمد پرویز کی تحریروں کی بنیاد پر چار سو علماء کا فتویٰ تھا کہ وہ کافر ہے۔ پرویز کی شخصیت تو اپنی جگہ ہے' لیکن یہ فتنہ بہت پھیلا ہوا ہے' کہیں ذرا کم درجے میں ہے اور کہیں زیادہ وسعت کے ساتھ ہے' اور حدیثِ نبویؐ کے انکار اور اس سے آزادی حاصل کرنے کا جذبہ ہر جگہ موجود ہے۔ اور قرآن کو جب حدیث سے کاٹ دیا جائے گا تو آپ کو آزادی ہوگی کہ قرآن کی جو چاہیں تعبیر (interpretation) کر لیں۔ یہ ہے آج کے جدید تعلیم یافتہ ذہن کا پس منظر جس کے نتیجے میں حدیث اور سنت

کے خلاف سارے کا سارا مواد جمع کیا گیا۔ اسی آزادی کے بارے میں کبھی اکبرالٰہ آبادی نے کہا تھا ۔

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ
گلے میں جو آئے وہ تانیں اڑاؤ

کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسر
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ!

انگریزی دَور میں نبوت کا دعویٰ ہو گیا' کسی نے کچھ نہیں کہا۔ کوئی کیا کہہ سکتا تھا! اب بھی جو چاہو علی الاعلان کہہ دو' کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ کوئی نبوت کا دعویٰ کر دے کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ آپ کے ہاں گوہر شاہی صاحب ہیں جو کہتے ہیں کہ ان کی شبیہہ چاند میں نظر آتی ہے' ناسا کا تو جعلی سرٹیفکیٹ بھی لے آئے ہیں۔ بہرحال جو بھی کہو کوئی پکڑنے والا نہیں ہے۔ منصور نے ''اَنَا الْحَق'' کہا تھا اور اس کو پھانسی ہو گئی' لیکن آپ جو چاہیں کہہ دیں کوئی آپ کو پھانسی دینے والا نہیں ہے۔ سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین جو چاہیں بکواس کرتے پھریں' کوئی ان کی گردن ناپنے والا نہیں ہے۔ یہ فتنہ بڑھتے بڑھتے اپنی پوری شدت کو پہنچنے والا ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا! ابھی تو دجال کا ظہور ہونا ہے۔

قرآن وسنت کا ربط وتعلق

اب یہ سمجھ لیجیے کہ قرآن اور سنّت میں کیا باہمی ربط وتعلق ہے۔ قرآن مجید میں اطاعت رسولؐ پر انتہائی زور دیا گیا ہے۔ دین تو نام ہی اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی اطاعت کا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ج فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴾ (التغابن:۱۲) ''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اس کے رسول کی' اور اگر روگردانی کرو گے تو ہمارے رسول پر سوائے پہنچا دینے کے اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے''۔ باقی ذمہ داری تمہاری ہے' اللہ تم سے پوچھ لے گا۔ سورۃ النساء میں فرمایا: ﴿مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ ج﴾ (آیت

۸۰)''جو رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے''۔ اور فرمایا: ﴿وَمَا اَرۡسَلۡنَا مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ﴾ (آیت ۶۴)''ہم نے نہیں بھیجا کوئی بھی رسول مگر اسی لئے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے''۔ قرآن مجید میں تمام رسولوں کی دعوت بیان ہوئی ہے: ﴿اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰهَ وَاَطِيۡعُوۡنِ ﴾''اللہ کی بندگی اختیار کرو اور میری اطاعت کرو''۔ رسول کی اطاعت کا مطلب ہے کہ اس کی سنّت اور اس کی احادیث کے مطابق عمل کیا جائے' لیکن میں یہ بحث اس لئے چھوڑ رہا ہوں کہ ان لوگوں نے بڑی چالاکی سے تعبیر کر لی ہے کہ اطاعت رسول کا حکم صرف اُس دَور کے مسلمانوں کے لئے تھا' اس لئے کہ اُس وقت جو مسلمان تھے حضور ﷺ ان کے امیر بھی تھے۔ آپ ﷺ اللہ کے رسول بھی تھے اور مسلمانوں کے امیر بھی تھے' خلیفہ اور حاکم بھی محمد رسول اللہ ﷺ تھے۔ منکرین سنّت کے نزدیک آپ ﷺ کی اطاعت امیر المؤمنین اور خلیفۃ اللہ کے اعتبار سے تھی اور یہ بعد میں آنے والوں کے لئے نہیں ہے۔ آپ کی دو ذمہ داریاں اور دو حیثیتیں تھیں' ایک حیثیت رسول کی تھی' اور قرآن پہنچا دینے پر وہ ذمہ داری ختم ہوگئی' دوسری حیثیت اُس وقت کے سربراہِ ریاست ہونے کے اعتبار سے تھی۔ اس کے لئے غلام احمد پرویز نے''مرکز ملت'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اس وقت حضور ﷺ مرکز ملت تھے لہٰذا آپؐ کی اطاعت ہر مسلمان پر فرض تھی' لیکن اب جو مرکز ملت ہوگا' یعنی جو حکومت ہوگی' جو نظام الوقت ہوگا بس اسی کا حکم ماننا پڑے گا۔ وہ قرآن کی جو تعبیر کرے گا وہ آپ کو تسلیم کرنی پڑے گی۔ اس فتنہ کے پھیلانے والے علامہ اقبال کے بہت بڑے خوشہ چین ہونے کے دعوے دار ہیں' حالانکہ اقبال تو یہ کہہ کر دنیا سے گئے تھے۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

یعنی اپنے آپ کو محمد مصطفیٰ ﷺ کے قدموں میں پہنچا دو' اس لئے کہ دین تو نام ہی اس کا ہے۔ اگر محمد مصطفیٰ ﷺ تک نہیں پہنچو گے تو یہ سب بولہبی ہے جو تم اختیار کر رہے ہو' گویا

تم ابولہب کے پیروکار ہو‘ محمد رسول اللہ ﷺ کے پیروکار نہیں ہو۔ دین نام ہے قرآن و سنّت کا۔ قرآن آپ پر نازل ہوا۔ کیا قرآن کا نزول ہوتے ہوئے کسی نے دیکھا تھا؟ یہ تو حضور ﷺ کا اپنا دعویٰ ہے کہ یہ قرآن اللہ کی طرف سے مجھ پر نازل ہوا ہے۔ چنانچہ جو قرآن کی اطاعت کر رہے ہیں وہ حضور ﷺ کی بھی اطاعت کر رہے ہیں‘ قرآن کو تو آپ نے حضور ﷺ کے کہنے پر مانا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے‘ لہٰذا اصل میں اطاعت تو رسول کی ہے۔ لیکن افسوس کہ علامہ اقبال کے بیٹے جاوید اقبال صاحب اس وقت انکارِ حدیث کے فتنے میں غلام احمد پرویز سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ غلام احمد پرویز نے کھل کر یہ نہیں کہا کہ قرآن کے احکام میں بھی ردّ و بدل ہو سکتا ہے۔ اس نے قرآن کی غلط تعبیر ضرور کی ہے‘ لیکن قرآن کے متن (text) کے بارے میں اس نے مانا کہ یہ تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ڈاکٹر جاوید اقبال تو کہتے ہیں کہ قرآن کے جو نصوص ہیں ان میں بھی اجتہاد ہو سکتا ہے‘ ان میں بھی تبدیلی کی جا سکتی ہے‘ یہ کوئی مستقل اور دائم نہیں ہیں۔ یہ اس انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ ان کے نزدیک تو خالص سیکولر نظام ہی خالص اسلامی نظام ہے۔ خالص سیکولر نظام سے مراد اُن کی کیا ہے؟ وہ نظام جس میں کسی مذہب کو بھی فوقیت حاصل نہ ہو۔ لیکن آج تک دنیا میں کوئی نظام ایسا نہیں ہے۔ امریکہ میں سیکولر نظام ہے‘ لیکن عیسائیت کو تو وہاں فوقیت حاصل ہے اور ساری حکومتی سرپرستی حاصل ہے۔ وہاں چھٹیاں ہوں گی تو بڑے دنوں کی ہوں گی‘ گڈ فرائیڈے کی ہوگی (جمعۃ الوداع کی تو نہیں ہوگی۔) وہاں سیکولر نظام اس معنی میں ہے کہ کسی مذہب کی بنیاد پر وہاں کوئی قانون نہیں بنتا‘ لیکن بہرحال ایک مذہب کو تو حکومتی سرپرستی حاصل ہے اور اسے ریاستی مذہب کی حیثیت حاصل ہے۔ جاوید اقبال تو کہتے ہیں کہ ریاست کا کوئی مذہب بھی نہ ہو‘ بس لوگوں کی اپنی مرضی سے قوانین بنیں‘ اور یہ کہ مکمل سیکولر نظام آج کے دور میں خالص اسلامی نظام ہے۔ اس پر اقبال کے الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ ؏

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن!

پوری دنیا میں ان کی پسرِ اقبال ہونے کی وجہ سے آؤ بھگت ہوتی ہے۔ USSR کے خاتمے کے بعد جو ترکستانی ریاستیں آزاد ہوئی ہیں' جاوید اقبال صاحب نے یہاں کے دَورے کیے تو ہر جگہ ان کا والہانہ استقبال ہوا ہے۔ فارسی زبان ان تمام ریاستوں میں سمجھی جاتی ہے اور علامہ کا دو تہائی کلام فارسی میں ہے' لٰہذا علامہ اقبال کے حوالے سے ان کی آؤ بھگت ہو رہی ہے' لیکن ان کا حال یہ ہے کہ وہ ان تمام تعلیمات کی جڑ کاٹ رہے ہیں جو علامہ اقبال نے پیش کیں۔ بہر حال اس حوالے سے میں نے عرض کیا کہ اس وقت اس فتنے کی بہت زیادہ وسعت ہے۔

اطاعت رسول کی اہمیت پر قرآن حکیم میں متعدد آیات وارد ہوئی ہیں' لیکن منکرین حدیث نے ان کی تاویل کر لی ہے' جو بہت ہوشیاری کا مظہر ہے۔ جہاں بھی ''اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ'' آیا ہے اس سے انہوں نے یہ مراد لی ہے کہ اپنے اپنے دَور کے امیر اور مرکزِ ملت کی اطاعت کی جائے۔ لٰہذا اطاعتِ رسولؐ سے متعلق آیات اس وقت میں بیان نہیں کر رہا' بلکہ میں نے وہ آیات پڑھی ہیں جن میں تعلیم و تبلیغ کا ذکر آیا ہے۔ جب وحی کا نزول ہوتا تھا تو حضور ﷺ تیزی سے اس کو دہراتے تھے اور تکرار کرتے تھے' جیسے حافظ لوگ یاد کرتے ہیں' کہ میں کہیں بھول نہ جاؤں۔ اس مشقت سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بری کر دیا۔ فرمایا:

﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝﴾ (القیامۃ:١٦'١٧)

''اے نبی! اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لئے اپنی زبان کو حرکت نہ دو۔ اس کو یاد کرا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے''۔

اے نبی! آپ یہ مشقت نہ جھیلیں' اس قرآن کو جمع کر دینا ہمارے ذمہ ہے' ہم اسے آپ کے سینے میں محفوظ کر دیں گے' پھر آپ بھولیں گے نہیں۔ ﴿سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓی ۝﴾ (الاعلیٰ:٦) ''ہم آپ کو پڑھوا دیں گے' پھر آپ بھولیں گے نہیں''۔ آپ کے سینے میں قرآن کو محفوظ کرنا ہمارے ذمہ ہے۔ سورۃ القیامۃ کی متذکرہ بالا آیت میں دو لفظ ''جَمْعَهٗ'' اور ''قُرْاٰنَهٗ'' آئے ہیں۔ قرآن جمع تو ہو گیا' لیکن جمع کس ترتیب سے

ہوگا یہ ترتیب بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے معین کر دی گئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ترتیب نزولی اعتبار سے پہلے مکی سورتیں ہونی چاہئیں' پھر مدنی سورتیں۔ چنانچہ قدرے سب سے چھوٹی سورتیں جو سب سے آخر میں ہیں' سب سے پہلے ہونی چاہئیں' ابتداء میں تو وہی نازل ہوئی ہیں' لیکن نہیں! لوحِ محفوظ اور کتابِ مکنون میں مصحف کی ترتیب اور ہے' اور وہ یہی ہے جو آج ہمارے سامنے قرآن میں ہے' لیکن نزول کی ترتیب اور تھی۔ کیوں؟ اس لئے کہ قرآن حضور ﷺ کی دعوت اور تحریک کے ساتھ ساتھ نازل ہو رہا تھا' ہر دَور کا جو تقاضا تھا' جو سوال اٹھ رہے تھے' جو اشکالات پیدا ہو رہے تھے ان کا جواب اس دَور میں نازل ہوتا گیا اور آنحضور ﷺ اور اہل ایمان کو اس دَور کی مناسبت سے ہدایات دی جاتی رہیں۔ گویا کہ نزولی ترتیب کی سیرت کے ساتھ مطابقت ہے' لیکن اصل ترتیب لوحِ محفوظ میں یہی ہے جو قرآن ہمارے پاس ہے۔ اللہ نے کہا کہ اس کا جمع کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے اور اس کی ترتیب بھی ہمارے ذمہ ہے۔ ﴿فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ یعنی جب ہم آپ کو اس ترتیب کے ساتھ پڑھوا دیں تو پھر اسی ترتیب کی پیروی کیجئے۔ یہ نہیں ہوگا کہ مکی سورتیں پہلے اور مدنی بعد میں۔ نہیں' بلکہ ترتیب یہ ہوگی جو ہے۔ یعنی پہلے سورۂ فاتحہ' پھر بقرہ' پھر آل عمران...... اور ہمیں معلوم ہے کہ ہر رمضان میں حضرت جبرائیل علیہ السلام کے ساتھ حضور ﷺ قرآن کا دَورہ کیا کرتے تھے۔ جتنا قرآن اُس وقت تک نازل ہو چکا ہوتا اس کا دَورہ فرماتے۔ اور آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری رمضان میں حضور ﷺ کا حضرت جبرائیلؑ کے ساتھ پورے قرآن پاک کا دو مرتبہ دَورہ ہوا ہے۔ جیسے رمضان کی آمد پر حفاظ دورہ کرتے ہیں اور پھر اسے تازہ کرتے ہیں ایسے ہی حضور ﷺ نے حضرت جبرائیلؑ کے ساتھ اپنی حیاتِ طیبہ کے آخری رمضان میں دو مرتبہ دَورہ کیا۔ یہ ترتیب ہے جو اللہ نے اپنے ذمہ لی تھی۔

تبیینِ قرآن...... رسول اکرمؐ کی اہم ذمہ داری

آگے فرمایا: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ پھر اس کی تبیین اور اس کی وضاحت بھی

ہمارے ذمہ ہے۔ یہ بات خاص طور پر نوٹ کر لیجئے کہ ایک ہے قرآن اور ایک ہے قرآن کی وضاحت جو اللہ نے اپنے ذمہ لے لی۔ قرآن مجید میں سورۃ النساء کے آخر میں فرمایا: ﴿یَسْتَفْتُوْنَکَ ؕ قُلِ اللّٰهُ یُفْتِیْکُمْ فِی الْکَلٰلَةِ ؕ﴾ ''(اے نبی!) یہ لوگ آپ سے (کلالہ کے معاملہ میں فتویٰ) پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں کلالہ کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے''۔ ''مفتی اعظم'' تو حقیقت میں وہی ہے۔ یہ گویا کہ قرآن کا بیان اور قرآن کی تبیین قرآن سے ہو رہی ہے' اس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن سورۃ النحل کی اس آیت میں محمد رسول اللہ ﷺ سے خطاب ہے:

﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ ۝﴾ (النحل: ٤٤)

''اور (اے محمدؐ!) ہم نے آپ کی جانب یہ ''الذکر'' (قرآن) نازل کیا ہے تا کہ آپ لوگوں کے لئے اس کی تشریح و توضیح کر دیں جو کچھ کہ ان کے لئے نازل کیا گیا ہے''۔

اب قرآن تو آ گیا' چاہے قرآن میں توضیحی آیات بھی آ گئیں' لیکن فرمایا: ''لِتُبَیِّنَ'' کہ آپؐ واضح کر دیں۔ یہ واحد مخاطب کا صیغہ ہے۔ یہ آپؐ کا فرض منصبی ہے کہ اب تبیین کریں' واضح کریں' کھولیں۔ ظاہر بات ہے' دنیا کا ہر شخص جانتا ہے کہ ایک کتاب (text) ہے' ایک اس کی شرح ہوتی ہے۔ شرح میں مشکل الفاظ کے معانی بیان کئے جاتے ہیں۔ اس میں کہیں کوئی اشکال ہے تو اس کو حل کیا جاتا ہے۔ کہیں کوئی سوالات پیدا ہوتے ہیں تو ان کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ یہ تبیین (وضاحت) ہے۔ یہ کس کا فرضِ منصبی ہے؟ ﴿لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ﴾ ''تا کہ آپ واضح کریں لوگوں کے لئے اس شے کو جو اُن کی طرف نازل کی گئی''۔ یعنی آپؐ کی طرف ان کے لئے نازل کی گئی۔ ظاہر بات ہے کہ یہ تو لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل کی گئی ہے' اگرچہ آپؐ پر نازل کی گئی ہے۔ یہاں یہ ایک لفظ ''تبیین'' نوٹ کر لیجئے' از روئے قرآن یہ محمد رسول اللہ ﷺ کا فرضِ منصبی ہے۔

اب آگے چلئے! قرآن حکیم میں چار مرتبہ حضور ﷺ کی شان میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ﴾ ''وہ انہیں اللہ کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں' لوگوں کا تزکیہ کرتے ہیں اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں''۔ تعلیم کسے کہتے ہیں؟ معلم کا کام کیا ہوتا ہے؟ نصاب میں ایک کتاب شامل ہے' یہ text ہے' معلم اسے پڑھاتا ہے۔ وہ اس کے مشکل الفاظ کی وضاحت کرے گا' اس میں جو سوالات پیدا ہوں گے ان کے جوابات دے گا' کہیں کوئی ابہام یا اجمال ہے تو اس کی تفصیل بیان کرے گا اور اسے واضح کرے گا۔ یہی تعلیم ہے۔ معلم کی ضرورت ہر شخص تسلیم کرتا ہے۔ اگر تعلیم صرف کتابوں سے ہو جاتی تو پھر اساتذہ کی ضرورت نہیں تھی۔ کتاب وحکمت کی تعلیم رسول اللہ ﷺ کی ذمہ داری ہے۔ بعض لوگ ﴿یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ ﴾ میں ''حکمت'' سے مراد حدیث لیتے ہیں اور یہ امام شافعی کا بھی قول ہے۔ میں اس رائے کی بھی قدر کرتا ہوں' لیکن ایک قول یہ بھی ہے کہ حکمت سے مراد قرآن مجید ہی کی حکمت مراد ہے۔ قرآن خود کہتا ہے:

﴿ذٰلِکَ مِمَّآ اَوْحٰٓی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَۃِ ط﴾ (بنی اسرائیل:۳۹)
''یہ وہ باتیں ہیں اے نبیؐ! جو ہم نے آپ کی طرف وحی کی ہیں از قسم حکمت''۔

چنانچہ حکمت قرآن میں بھی ہے' جبکہ ''کتاب'' سے مراد احکام ہیں۔ قرآن مجید میں دلائل کا حصہ ''آیات'' پر مشتمل ہے ﴿یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ ﴾' اخلاقیات تزکیہ ہیں ﴿وَیُزَکِّیْھِمْ ﴾' احکامِ شریعت ''کتاب'' ہے اور پھر اس کی حکمت' دانائی اور اصول ''حکمت'' ہے۔ چاروں چیزیں قرآن کی ہیں۔ لیکن یہ تو مانئے کہ ان دونوں چیزوں کے لئے معلم رسول اللہ ﷺ ہیں۔ معلم کتاب بھی محمد ﷺ ہیں' معلم حکمت بھی محمد ﷺ ہیں۔ معلم کا کام کیا ہوتا ہے؟ معلم کا کام صرف کتاب پڑھ کر سنا دینا تو نہیں ہوتا' بلکہ معلم سکھاتا ہے' سمجھاتا ہے۔ پھر معلم کچھ امتحان بھی لیتا رہتا ہے' پہلی باتیں سن اور سمجھ لی ہیں تو اگلی سناتا ہے۔ حضور ﷺ لوگوں سے سوال کیا کرتے تھے۔ مثلاً آپؐ نے پوچھا: ((اَتَدْرُوْنَ مَنِ الْمُفْلِسُ؟)) ''جانتے ہو مفلس کون ہے''؟ لوگوں نے اپنی

سمجھ کے مطابق جواب دیا' آپ نے پھر اس کی وضاحت کی۔ اسی طرح آپؐ نے دریافت کیا: ((اَیُّ الْخَلْقِ اَعْجَبُ اِیْمَانًا؟)) ''آپ کے نزدیک سب سے زیادہ حسین ایمان کس کا ہے؟'' صحابہؓ نے ایک جواب دیا' آپؐ نے ردّ کیا' انہوں نے دوسرا جواب دیا' آپؐ نے ردّ کیا' تیسرا جواب دیا' آپؐ نے ردّ کیا' پھر آپؐ نے وضاحت کی: ((اِنَّ اَحْسَنَ الْخَلْقِ اَعْجَبُ اِلَیَّ اِیْمَانًا لَاِخْوَانُنَا الَّذِیْنَ یَاْتُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ یَجِدُوْنَ صُحُفًا مِنْ کِتَابِ اللّٰہِ فَیُؤْمِنُوْنَ بِمَا فِیْھَا)) ''میرے نزدیک حسین ترین ایمان ہمارے ان بھائیوں کا ہوگا جو میرے بعد آئیں گے (جنہیں میری صحبت نہیں ملی ہوگی) انہیں اوراق ملیں گے جن پر اللہ کی کتاب لکھی ہوئی ہوگی اور وہ اس پر ایمان لائیں گے''۔ حضور ﷺ سوال پوچھتے تھے' صحابہؓ جواب دیتے تھے' پھر حضور ﷺ وضاحت فرماتے تھے۔ اسی طرح صحابہؓ آپؐ سے مختلف سوالات پوچھتے اور آپؐ جواب دیتے تھے۔ تعلیم ایک نظام ہے۔ ﴿یُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ﴾ ''وہ کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں''۔

یہ تعلیم آیا قرآن ہی ہے یا قرآن پر مزید کچھ ہے؟ قرآن تو text ہے' اس کی تبیین تو ایک علیحدہ شے ہوگی۔ مفسرین قرآن کی تفسیر لکھتے ہیں' وہ قرآن تو نہیں ہوتی۔ شرح دیوانِ غالب لکھی گئی ہے' ظاہر ہے دیوانِ غالب اور ہے' شرح اور ہے۔ علامہ اقبال کے کلام کی شرح بھی لکھی گئی ہے' غلام رسول مہر نے بھی لکھی ہے' پروفیسر یوسف سلیم چشتی نے بھی لکھی ہے۔ یہ شرحیں کیوں لکھی گئیں؟ کلام کی وضاحت کے لئے! ظاہر ہے شرح اور ہے' کلام اور ہے۔ چنانچہ قرآن اور ہے' اس کی تبیین اور ہے۔ قرآن اور ہے' قرآن کی تعلیم اور ہے۔ تو ظاہر بات ہے ان میں مغائرت ہوگی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کی جو تشریح حضور ﷺ نے کی آیا وہ اپنے جی سے کی' اپنی سمجھ سے کی' اپنے فہم اور اپنے اجتہاد سے کی یا وہ بھی اللہ کی طرف سے ہے؟ یہ بات بڑے کانٹے کی ہے۔ اس ضمن میں میری سب سے پہلی دلیل یہ ہے کہ اللہ نے

کہا تھا کہ اس کی تبیین میرے ذمہ ہے: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ ۞﴾ عملاً وہ تبیین محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانی ہو رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تبیین بھی من جانب اللہ ہے۔ یہ تبیین حضور ﷺ کے ذریعے سے ہو رہی ہے' جبکہ یہ درحقیقت اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ اس بات کو سمجھ لیجئے!

وحی کی اقسام

ہم وحی جلی و وحی خفی کہتے ہیں۔ پہلے تو یہ جان لیں کہ وحی کسے کہتے ہیں! لغت میں وحی کے معنی ''اعلام بالخفاء'' کے ہیں۔ یعنی کوئی شے کسی کو اشارے سے سمجھا دینا۔ ع

"تری عینها عینی فتعرف وحیها"

شاعر اپنی محبوبہ کے بارے میں کہتا ہے کہ اس کی آنکھ میری آنکھ کو دیکھتی ہے تو اس کی وحی کو پہچان لیتی ہے۔ یعنی اس کی آنکھ میری آنکھ کا اشارہ پہچان لیتی ہے۔ آنکھوں آنکھوں میں جو بات ہوئی ہے اسے شاعر نے وحی کہا ہے۔ اللہ کی طرف سے وحی جمادات کو بھی ہوتی ہے۔ آسمانوں کو بھی ہوئی ہے' زمین کو بھی ہوئی ہے۔ ﴿بِاَنَّ رَبَّكَ اَوۡحٰى لَهَا ﴾ (الزلزال: ۵) ''کیونکہ تیرے ربّ نے اس پر وحی کی تھی''۔ وحی پرندوں' شہد کی مکھی اور انسانوں کو بھی ہوتی ہے' غیر نبی کو بھی ہوتی ہے۔ اسے اب وجدان (intution) کہتے ہیں۔ یعنی دفعتاً کوئی خیال ذہن میں آ گیا' نہ آپ سوچ رہے ہیں' نہ صغریٰ کبریٰ آپ نے جوڑا تھا کہ اچانک ایک خیال آ گیا۔ آپ کہتے ہیں وجدانی طور پر مجھے یہ بات معلوم ہوگئی۔ یہ وجدان (intution) کہاں سے آ گیا؟ اسے ہم الہام بھی کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بندوں پر الہام فرماتا ہے' کبھی خواب میں کچھ دکھا دیتا ہے۔ رؤیائے صادقہ کو نبوت کا چھیالیسواں یا ساٹھواں جزو کہا گیا ہے۔ حضور ﷺ پر بھی جب وحی کا آغاز ہوا تو پہلے تو آپؐ کو سچے خواب آنے شروع ہو گئے تھے۔ یعنی آپؐ نے خواب میں کوئی واقعہ دیکھا اور کچھ دنوں بعد وہ واقعہ جوں کا توں ظہور پذیر ہو گیا۔ یہ پہلے سے خبر کہاں سے آ گئی' جبکہ ابھی تو واقعہ ہوا ہی نہیں تھا؟ یہ حضور ﷺ نے

کیسے دیکھ لیا تھا؟ یہ بھی وحی ہے۔ اسے ہم وحی خفی کہتے ہیں۔ وحی خفی کی ایک قسم تحدیث ہے۔ اللہ اپنے بندوں سے وحی کے ذریعے سے کلام بھی کرتا ہے۔ اسی لئے حضور ﷺ نے فرمایا کہ ہر نبی کی اُمت میں محدَّث ہوتے ہیں جن سے اللہ کلام کرتا ہے اور میری اُمت کے محدَّث عمر (رضی اللہ عنہ) ہیں۔ اللہ ان سے کلام کرتا ہے۔ اس ضمن میں ایک چیز ''تفہیم'' ہے کہ اللہ سمجھا دیتا ہے۔ قرآن میں آیا ہے کہ حضرت داوٗدؑ کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا' وہ اس وقت کے بادشاہ تھے۔ حضرت سلیمان ایک شہزادے کی حیثیت سے اس مقدمے کی کارروائی سن رہے تھے۔ اس مسئلے کا حل حضرت داوٗدؑ کی سمجھ میں نہیں آیا تو ﴿فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ﴾ ''ہم نے یہ معاملہ سلیمان کو سمجھا دیا''۔

ان کے علاوہ وحی خفی کی ایک قسم ''اراءت'' بھی ہے۔ سورۃ النساء میں فرمایا:

﴿اِنَّـا اَنْـزَلْـنَـا اِلَيْـكَ الْـكِتٰبَ بِـالْـحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا اَرٰىكَ اللّٰهُ ط﴾ (آیت ۱۰۵) ''(اے نبیؐ!) ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ آپ کی طرف اتاری ہے تاکہ آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں اس کے مطابق جو اللہ نے آپ کو دکھایا ہے''۔ یعنی اللہ رسول کو دکھاتا بھی ہے۔ رسولؐ کے علاوہ غیر رسول کو بھی جب چاہے دکھا دیتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں خطبہ دے رہے تھے' اس وقت اللہ نے حضرت عمرؓ کو شام کا میدانِ جنگ دکھایا۔ حضرت ساریہؓ ایک ٹیکنیکی غلطی کر رہے تھے' حضرت عمرؓ نے یہاں سے حکم دیا'' يَا سَارِيَةُ الْجَبَل '' کہ اے ساریہ کیا کر رہے ہو؟ تم پہاڑ کی طرف ہو جاؤ! اُدھر ساریہؓ نے حضرت عمرؓ کی آواز سنی اور اس کے مطابق عین حالت جنگ میں اپنی پوزیشن درست کی۔ اراءت' تحدیث' تفہیم' رؤیائے صادقہ' الہام' کشف وغیرہ یہ ساری چیزیں وحی خفی کہلاتی ہیں۔

البتہ یہ نوٹ کر لیجئے کہ نبی کی وحی خفی بھی محفوظ ہوتی ہے' اس میں نہ تو شیطان کی آمیزش ہو سکتی ہے' نہ نفس کی آمیزش ہو سکتی ہے۔ نبی محفوظ ہے' اس کی حفاظت کی گئی ہے۔ چنانچہ خواہ وحی جلی آ رہی ہو خواہ وحی خفی' اس میں شیطان کچھ داخل نہیں کر سکتا۔ اس کی حفاظت ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ الجن میں بیان کیا گیا ہے کہ جب

رسولؐ کو وحی بھیجی جاتی ہے تو ہم اس کے آگے اور پیچھے پہرے ساتھ بھیجتے ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے جب سورۃ الانعام نازل ہوئی تو ستر ہزار فرشتے اس کے ساتھ اترے۔ وحی کی پوری حفاظت کی جاتی ہے کہ کہیں شیطان اس میں کوئی شے داخل نہ کر دے۔ وحی جلی کے الفاظ بھی اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں' لہٰذا وہ لفظاً بھی محفوظ ہے۔ وحی خفی جب نبی کو ہوتی ہے تو وہ بھی محفوظ ہوتی ہے۔ مجھے اور آپ کو ہوگی تو اس میں میرے اور آپ کے ذہن کی آمیزش بھی ہوسکتی ہے' اس میں میرے اپنے تصورات بھی ہو سکتے ہیں' میری اپنی دبی ہوئی خواہشات بھی رنگ آمیزی کر سکتی ہیں' wishful thinkings بھی آ سکتی ہیں' شیاطین جن بھی اس میں اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ میری اور آپ کی وحی خفی محفوظ نہیں ہے۔ نبی کی وحی خفی بھی محفوظ ہوتی ہے' لیکن اس کے الفاظ محفوظ نہیں ہوتے۔ مفہوم اللہ کی طرف سے آتا ہے' الفاظ نبی کے ہوتے ہیں۔

قرآن اور حدیث میں یہی فرق ہے کہ حدیث کا مفہوم اللہ کی طرف سے ہے' الفاظ اللہ کی طرف سے نہیں ہیں۔ چنانچہ حضورؐ نے اپنے الفاظ استعمال کئے اور صحابہ نے سنے۔ انہوں نے بھی کوشش کی کہ حضور ﷺ کے الفاظ آگے بیان کریں' لیکن فرق ہو بھی سکتا ہے۔ حدیث جبرائیل بہت مشہور حدیث ہے جس کو ''اُمُّ السُّنَّةِ'' کہا گیا ہے۔ گویا یہ تمام حدیثوں کی ماں ہے۔ اس کی ساری روایتوں میں تھوڑا تھوڑا لفظی فرق موجود ہے۔ حضرت عمر' حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہم) کی روایات میں الفاظ کا اختلاف ہے' لیکن مفہوم ایک ہی ہے۔ وحی جلی جب نبی کو ہوتی ہے تو وہ شیطانی وسوسوں اور انسان کے اپنے خیالات سے لفظاً بھی محفوظ ہوتی ہے' اس کے text کو محفوظ کرنے کی ذمہ داری اللہ لے لیتا ہے' لیکن وحی خفی جب نبی کو ہوتی ہے تو اس کا مفہوم محفوظ رہتا ہے مگر الفاظ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتے۔ لہٰذا اس کے الفاظ کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیا گیا۔ حضور ﷺ نے اسے اپنے الفاظ میں بیان کیا اور صحابہؓ کے بیان کرنے میں کوئی معمولی انیس بیس کا فرق ہوسکتا ہے' لیکن مفہوم بہر حال اللہ کی طرف سے ہے۔

یہ ہے قرآن حکیم کی توضیح وتبیین کا وہ ذریعہ (source) جو خود اللہ نے معین فرما دیا۔ حالانکہ یہ اصلاً اللہ کے ذمہ تھا ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ﴾ ''پھر اس کی وضاحت' اس کا بیان ہمارے ذمہ ہے''۔ لیکن عالم واقعہ میں اس کا بیان' تبیین' تشریح' تعلیم' توضیح محمد رسول اللہ ﷺ سے کرائی گئی۔ فرمایا: ﴿وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الذِّكۡرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيۡهِمۡ﴾ ''اور (اے نبیؐ!) ہم نے نازل کیا آپ کی طرف یہ ذکر (قرآن) تا کہ آپ کھول کر بیان کر دیں لوگوں کے لئے جو ہم نے ان کے لئے نازل کیا ہے''۔ اور اس تبیین اور تفسیر کا ذریعہ وحیٔ خفی تھا۔

وحی جلی کو ہم وحی متلو بھی کہتے ہیں' جس کی ہم تلاوت کرتے ہیں۔ قرآن وحی جلی ہے' یہ سارا کا سارا فرشتے کے ذریعے سے آیا ہے' یہ ''الہامی'' نہیں ہے۔ کسی نے لکھا تھا کہ ہندوستان کی دو کتابیں الہامی ہیں' ایک ''وید'' اور دوسرا ''دیوانِ غالب''۔ الہام تو عام لوگوں کو بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا تخیل کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ اقبال نے غالب کے بارے میں کہا تھا ؎

فکر انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغ تخیل کی رسائی تا کجا!

غالب اپنے بارے میں خود کہتا ہے ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے!

یعنی میں جب اپنے قلم سے لکھتا ہوں تو میرے قلم کے چرچرانے کی آواز درحقیقت فرشتے کی آواز ہے۔ لیکن قرآن الہام نہیں ہے' قرآن وحی ہے۔

عیسائیوں کے ہاں بائبل کی چار کتابیں ہیں جنہیں وہ معتبر کہتے ہیں۔ اب ان سے کوئی پوچھ سکتا ہے کہ صاحب اس میں کون سی انجیل اصل ہے؟ میں نے میڈیکل کالج میں تعلیم کے دوران ایک پادری سے یہ پوچھا تھا۔ منٹگمری (ساہیوال) میں بہت بڑا مشن ہاسپٹل ہے' میں وہاں پادری کے پاس گیا اور پوچھا "Which one of

"None of them is Bible?" وہ بہت ہوشیار اور کائیاں آدمی تھا۔ کہنے لگا: "None of them is Bible, Bible is in them." یعنی ان میں سے کوئی بھی بائبل نہیں ہے' بائبل ان کے اندر ہے۔ بائبل کا معاملہ یہ ہے کہ جو کچھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا وہ بھی بائبل کے اندر ہے' حضرت مسیحؑ کی سوانح بھی اس میں ہے' حضرت مسیح کے اپنے مواعظ اور اقوال بھی اس بائبل میں ہیں۔ اس میں یہ سب کچھ جمع ہو گیا ہے۔ ہمارے ہاں یہ تینوں چیزیں علیحدہ علیحدہ ہیں۔ قرآن الگ ہے' حدیث الگ ہے اور سیرت کی کتابیں الگ ہیں۔ قرآن کو محفوظ رکھا گیا کہ کوئی شے اس میں شامل نہ ہونے پائے۔ عیسائیوں کے نزدیک حضرت مسیح تو خدا کے بیٹے تھے۔ وہ ان کے حوارین کو رسول(Apostles) کہتے ہیں۔ یوحنا' متی' لوقا اور مرقس وغیرہ ان کے نزدیک رسول ہیں اور رسولوں کو inspiration ہوتی ہے۔ لفظی وحی (verbal revelation) کے وہ قائل نہیں ہیں۔ جسے ہم وحی کہتے ہیں وہ لفظی (verbal) ہے۔ یعنی وہی الفاظ جو اللہ نے محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیجے ہیں قرآن کے اندر جوں کے توں محفوظ ہیں۔ جبکہ inspiration کہتے ہیں دل میں خیال آنے کو۔ وہ revelation کے قائل نہیں' وہ inspiration کے قائل ہیں۔ علامہ اقبال کے زمانے میں ایف سی کالج کے پرنسپل ڈاکٹر یوئنگ ہوتے تھے۔ کسی دعوت میں دونوں جمع تھے۔ ڈاکٹر یوئنگ نے کہا: اقبال! میں نے سنا ہے آپ جیسا روشن خیال فلسفی اور حکیم و دانا انسان بھی verbal revelation (لفظی وحی) کا قائل ہے؟ علامہ اقبال نے جواب دیا کہ ہاں' میں قائل ہوں' اور مجھے تو اس کا ذاتی تجربہ ہے' مجھ پر جب شعر نازل ہوتا ہے تو وہ لفظوں میں ڈھلا ہوا آتا ہے' میں اس کے الفاظ بدلنا چاہوں بھی تو بدل نہیں سکتا۔ شاعری بھی تو الہام ہی ہے۔ اقبال کی شاعری کے بارے میں سب کو معلوم ہے کہ آپ نے فرمائشی شاعری کبھی کی ہی نہیں۔ ان پر تو شاعری کا طوفان آتا تھا جب آتا تھا۔ ان کے ہاں آمد ہی آمد ہے' آورد ہے ہی نہیں۔ درحقیقت علامہ اقبال کی شاعری الہامی ہے' سوائے ابتدائی چار پانچ سال کے۔ ۱۹۰۵ء تک کی شاعری تو گل و بلبل اور فراق و

وصال کی داستانیں ہیں' لیکن ۱۹۰۵ء میں اقبال یورپ جا کر مسلمان ہوا ہے۔ ؏

مسلماں کو مسلماں کر دیا تہذیب مغرب نے!

آج آپ کو بے شمار لوگ مل جائیں گے جو امریکہ جا کر مسلمان ہوئے ہیں۔ یہاں تھے تو نہ نمازیں پڑھتے تھے' نہ روزے سے سروکار تھا' نہ داڑھی تھی۔ وہاں جا کر آپ دیکھیں داڑھیاں رکھی ہوئی ہیں' نمازیں پڑھ رہے ہیں اور وہاں کی مذہبی سرگرمیوں میں حصّہ لے رہے ہیں۔ اقبال خود کہتا ہے کہ یہ مغربی تہذیب کا آتش کدہ ہے جس میں مجھے اللہ نے ڈال دیا' جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈال دیا گیا تھا۔ ؎

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل!

یعنی میں جانتا ہوں اس جدید فکر اور فلسفے کے اندر کس قدر گمراہی ہے۔ اس آگ میں سے نکل کر اقبال کو جو ایمان حاصل ہوا ہے وہ بڑا اپختہ ایمان ہے۔ پھر اس کی شاعری الہامی ہوئی ہے۔

اچھی طرح جان لیجئے کہ وحی متلو لفظاً بھی محفوظ تھی اور شیطانی و نفسانی آمیزش سے بھی محفوظ تھی۔ پھر اس کا ریکارڈ بھی محفوظ ہے' جبکہ وحی خفی لفظاً محفوظ نہیں تھی۔ حضور ﷺ کو تو القاء' تفہیم' تحدیث' الہام یا خواب کے ذریعے ایک خیال دیا گیا' جیسے آپؐ نے خواب میں دیکھا کہ آپ عمرہ کر رہے ہیں' آپؐ نے مسلمانوں کو عمرہ کا حکم دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین بار خواب میں دیکھا کہ آپ اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے ذبح کر رہے ہیں' اس کے لئے کوئی لفظی (verbal) یا جلی وحی نہیں آئی تھی' لیکن آپ نے بیٹے سے کہا: ﴿یٰبُنَیَّ اِنِّیۡۤ اَرٰی فِی الۡمَنَامِ اَنِّیۡۤ اَذۡبَحُکَ فَانۡظُرۡ مَاذَا تَرٰی ؕ﴾ ''بیٹا! میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں' اب تُو بتا' تیرا کیا خیال ہے؟'' ﴿قَالَ یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ ۫ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿﴾ (الصّٰفّٰت: ۱۰۲) ''(بیٹے نے) کہا: ابّا جان! کر گزریئے جو آپ کو حکم ہوا ہے' آپ ان شاء اللہ مجھے صابروں میں سے پائیں گے''۔

بیٹے کو خوب معلوم ہے کہ ابّا جان کا خواب بھی وحی ہے‘ اس لئے کہ نبی کا خواب وحی ہوتا ہے جو کہ اللہ کی طرف سے حکم ہے‘ لہٰذا اللہ کے اس حکم پر باپ بیٹا دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ ﴿فَلَمَّا اَسۡلَمَا وَتَلَّهٗ لِلۡجَبِيۡنِ ۞ وَنَادَيۡنٰهُ اَنۡ يّٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ ۞ قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّءۡيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۞﴾ (الصّٰفّٰت:۱۰۳۔۱۰۵) ”پھر جب اُن دونوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو پیشانی کے بل لٹا دیا اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیمؑ! تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں“۔ اس وحیِ خفی کے ذریعے سے قرآن کی تبیین ہو رہی ہے محمد رسول اللہ ﷺ کی زبان سے‘ مگر اللہ کی جانب سے۔ دیکھئے ڈاکٹر جاوید اقبال کیا کہہ رہے ہیں اور علامہ اقبال کیا کہہ رہے ہیں۔

گفتۂ اُو گفتۂ اللہ بود
گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود!

یعنی اگرچہ یہ بات اللہ کے بندے کے حلق سے نکل رہی ہے‘ لیکن یہ اللہ کا کلام ہے! قرآن حکیم میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَا يَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى ۞ اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى ۞﴾ (النجم:۳‘۴) ”وہ اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتے‘ یہ تو ایک وحی ہے جو اُن پر کی جاتی ہے“۔ یہ ضرور نوٹ کر لیجئے کہ بعض حضرات کا اگر یہ خیال ہے کہ جو بات بھی حضور ﷺ کہتے تھے‘ وحی سے کہتے تھے‘ تو وہ غلط ہے۔ حضور ﷺ کا اپنا اجتہاد بھی ہوتا تھا۔ آپؐ انسان تھے‘ انسان ہونے کے ناطے آپ اجتہاد بھی کرتے تھے۔ حکم آیا: ﴿وَاَنۡذِرۡ عَشِيۡرَتَكَ الۡاَقۡرَبِيۡنَ ﴾ (الشعراء:۲۱۴) ”(اے نبیؐ!) اپنے قریبی رشتہ داروں کو خبردار کیجئے“۔ آپؐ نے تدبیر اختیار کی‘ حضرت علیؓ سے کہا کہ کھانے کا اہتمام کرو اور بنو ہاشم کو کھانے کی دعوت دو‘ ان کے پاس کھڑے ہو کر میں اپنی بات کروں گا۔ یہ تدبیر امر ہے‘ اس میں آپ ﷺ کی اپنی سوچ اور اپنا غور و فکر بھی ہوتا تھا۔ یہ اجتہادی ہوتی تھی۔ اس تدبیرِ امر میں کوئی شے غلط ہو جاتی تو اللہ ٹوک دیتا تھا۔ اگر کسی شے پر نہیں ٹوکا گیا تو گویا کہ اللہ کی طرف سے تقریر ہو گئی۔ یعنی اللہ نے اسے برقرار

رکھا۔ حضور ﷺ کے جس اجتہاد پر قرآن مجید میں کوئی نفی نہیں آئی' اللہ نے اس کی تردید نہیں کی اور اس سے نہیں روکا وہ بھی گویا کہ اللہ کی طرف سے تقریر ہے۔ اسی لئے قرآن کو بھی تو حدیث کہا گیا ہے۔ ﴿فَبِاَیِّ حَدِیْثٍ بَعْدَهٗ یُؤْمِنُوْنَ ﴾ (المرسلات: ۵۰) ''اب اس قرآن کے بعد یہ کون سی حدیث پر ایمان لائیں گے؟'' ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِیْثِ کِتٰبًا مُّتَشَابِهًا...... ﴾ (الزمر: ۲۳) ''اللہ نے بہترین حدیث نازل کی ہے جس کے تمام اجزاء ہم رنگ ہیں''۔ چنانچہ قرآن بھی حدیث ہے' یہ اللہ کی حدیث ہے' اور جہاں حضور ﷺ نے اجتہاد کیا اور اللہ کی طرف سے اس پر کوئی تردید نہیں ہوئی تو گویا کہ وہ اللہ کی طرف سے تقریر ہے۔

وحیِ خفی کا ثبوت آیاتِ قرآنی سے

اس حوالے سے میں یہ بات آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں کہ سنّت جس کا ایک بہت بڑا ذخیرہ تحریری صورت میں موجود ہے' اس کا سارا معاملہ ان دو آیتوں کے حوالے سے سمجھ میں آئے گا کہ قرآن کی تبیین بھی اللہ نے اپنے ذمہ لی ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ ﴾ اور وہ حضور ﷺ کے ذریعے سے ہوئی ہے ﴿وَاَنْزَلْنَا اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ ﴾۔ یہ کام آپؐ کا ہے۔ چنانچہ قرآن کی تبیین محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول و فعل سے کی ہے۔ نماز پڑھ کر دکھائی ہے اور فرمایا ہے: ((صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ)) ''نماز اس طرح پڑھو جیسے تم مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو''۔ آپ نے اپنا عمل پیش کیا ہے۔ آپ نے اس کی وضاحت چاہے اپنے قول سے کی ہو چاہے اپنے عمل سے کی ہو' چاہے آپ کے سامنے کوئی کام کیا گیا اور آپ نے ٹوکا نہیں' یعنی تقریر کی' گویا یہ ساری تبیین درحقیقت اللہ کی ہے۔

اب اس وحی خفی کا یہ لوگ انکار کرتے ہیں۔ قرآن مجید کو تو مانتے ہیں' اگرچہ آیات کی تاویل و تعبیر کر کے انہیں من پسند معانی پہناتے ہیں' لیکن کہتے ہیں کہ وحی خفی کا ثبوت قرآن سے پیش کرو۔ اس کے لئے قرآن حکیم میں تین ثبوت بہت اہم ہیں:

۱۔ تحویل قبلہ: قبلے کی تحویل کا واقعہ بہت اہم تھا۔ حضور ﷺ نے مدینے میں آ کر مسلمانوں کو بیت المقدس کی جانب مُنہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا' چنانچہ سولہ مہینے تک بیت المقدس کی جانب مُنہ کر کے نمازیں پڑھی گئیں۔ اس کے بعد حکم آ گیا: ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ ''اب اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیر لیجئے!'' (اصل قبلہ یہ ہے۔) حضور ﷺ نے ادھر کا رُخ کر لیا۔ اب بہت سے لوگوں کو تشویش ہوگئی کہ اگر اصل قبلہ یہ تھا تو جو سولہ مہینے ہم نے بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی وہ تو غلط قبلے کی طرف ہوگئی اور وہ تو نمازیں ضائع ہوگئیں۔ اور نماز چونکہ ایمان کا اہم ترین رکن ہے لہٰذا ایمان ضائع ہو گیا۔ صحابہ کرامؓ کو اس کی جس قدر تشویش تھی اس کا اندازہ سورۃ البقرۃ میں تحویل قبلہ پر آنے والی طویل بحثوں سے ہوتا ہے۔ عام طور پر ہم تو پڑھتے ہوئے سوچتے ہیں کہ اس قدر تکرار' وضاحت اور بار بار اعادے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلہ پر بہت بڑا فتنہ کھڑا ہو گیا تھا۔ یہودی پہلے تو خوش ہوئے تھے کہ یہ لوگ ہمارے ہی قبلے کی پیروی کر رہے ہیں' یہ گویا ہمارے ہی camp followers ہیں۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں نے قبلہ بدل دیا تو انہیں معلوم ہوا کہ یہ ایک نئی اُمت ہے۔ اب ان کے کان کھڑے ہوئے۔ انہوں نے یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا کہ یہ کیسے نبی ہیں جن کا قبلہ ہی معین نہیں ہے' کبھی شمال میں قبلہ مقرر کرتے ہیں تو کبھی جنوب میں۔ ظاہر بات ہے ابھی سارے مسلمانوں کا ایمان اس قدر پختہ نہیں تھا۔ مہاجرین تو خیر بڑی ہی تربیت کے بعد آئے تھے' لیکن انصار تو ابھی نومسلم تھے۔ ان کے لئے واقعتاً یہ ایک بڑا فتنہ بن گیا تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

> ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَا اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ (البقرۃ:۱۴۳)
>
> ''(اے نبیؐ!) جس قبلے پر آپ (تحویل قبلہ سے) پہلے تھے وہ ہم نے صرف

یہ دیکھنے کے لئے مقرر کیا تھا کہ کون ہیں جو رسولؐ کی پیروی کرتے ہیں اور کون ہیں جو (اپنی آبائی عصبیتوں کی وجہ سے) اُلٹے پھر جائیں گے۔ یہ معاملہ بڑا سخت تھا' مگر اُن لوگوں کے لئے کچھ بھی سخت ثابت نہ ہوا جن کو اللہ نے ہدایت سے فیض یاب کیا تھا۔ اللہ تمہارے ایمان کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔ وہ تو لوگوں کے حق میں یقیناً شفیق و رحیم ہے''۔

عربوں کے لئے مکّہ مکرمہ اور خانہ کعبہ کی حیثیت گویا ان کی قومی یادگار (national monument) کی تھی۔ وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد تھے اور خانہ کعبہ ابراہیمؑ کا بنا ہوا تھا۔ اب جب ان سے کہا گیا کہ بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھو تو ان کی قومی عصبیت کا امتحان ہو گیا۔ ادھر رُخ کریں گے تو لامحالہ کعبے کی طرف پشت ہو گی۔ مدینے کا جغرافیہ ذہن میں لائیں' مکّہ اس کے جنوب میں ہے اور بیت المقدس شمال میں۔ مکّے کی طرف رُخ کریں گے تو بیت المقدس کی طرف پیٹھ ہو گی اور بیت المقدس کی طرف رخ کریں گے تو مکّے کی طرف پیٹھ ہو گی۔ یہ امتحان ہو گیا کہ آیا یہ محمد رسول اللہ ﷺ کا حکم مانتے ہیں یا اپنی آبائی عصبیتوں کی بنیاد پر انکار کر دیتے ہیں۔ اس آیت میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ یہ ہم نے اہل عرب کا ٹیسٹ لیا تھا۔ لیکن قرآن میں تو کہیں موجود نہیں کہ اللہ نے حکم دیا ہو کہ اے محمد! اپنے ساتھیوں سے کہہ دیں کہ اب آپ بیت المقدس کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھیں۔ جبکہ ﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ کُنْتَ عَلَیْھَا﴾ کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کہہ رہا ہے کہ اس کو ہم نے قبلہ ٹھہرایا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ وحی خفی کے ذریعے سے اللہ نے حضور ﷺ کو یہ حکم دیا تھا اور حضور ﷺ نے مسلمانوں کو بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا تھا' تاکہ ان کی آزمائش ہو جائے۔ اسی طرح اگر کچھ یہودی حضور ﷺ پر ایمان لے آئے تھے تو اب ان کا ٹیسٹ ہو گیا کہ کعبے کی طرف رُخ کرو! چونکہ یروشلم اُن کا قبلہ چلا آ رہا تھا' حضرت سلمانؑ کا بنایا ہوا ہیکل ان کا قبلہ تھا' لہٰذا اب ان کی آزمائش ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ نے تحویل قبلہ کی شکل میں دو طرفہ امتحان لے لیا۔ دیکھ لیجئے' یہاں قرآن کی

وحی جلی سے وحی خفی کا ثبوت مل رہا ہے۔ تحویل قبلہ کا حکم ۲ھ کا ہے۔

۲۔ بنو نضیر کا محاصرہ: ۴ھ میں مسلمانوں نے بنو نضیر کی آبادی کا محاصرہ کیا۔ اس کے چاروں طرف کھجور کے درخت لگے ہوئے تھے جو اُن کے لئے پناہ گاہ اور فصیل بنے ہوئے تھے۔ حضور ﷺ کے حکم سے صحابہؓ نے کھجور کے کچھ درخت کاٹ دیئے' اس لئے کہ یہ حملہ میں رکاوٹ بن رہے تھے۔ اس پر یہود نے بڑا طوفان اٹھادیا کہ دیکھو جی یہ کیسے نبی ہیں جو درخت کاٹ رہے ہیں' درخت کاٹنا تو شریف انسانوں کا شیوہ نہیں ہے۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ نے یوں دیا: ﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَائِمَةً عَلٰى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ...... ﴾ (الحشر: ۵) ''تم لوگوں نے کھجور کے جو درخت کاٹے یا جن کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا' یہ سب اللہ ہی کے اذن سے تھا''۔ یہ اللہ کا اذن قرآن میں تو نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ وحی جلی سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ اذنِ ربّ کسی اور شکل میں بھی آتا تھا' حکمِ ربّ قرآن کے سوا بھی آتا تھا۔

۳۔ افشائے راز کی اطلاع: حضور ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو ایک بات بتائی کہ راز رکھنا اور کسی کو بتانا نہیں: ﴿وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِيُّ اِلٰى بَعْضِ اَزْوَاجِهٖ حَدِيْثًا ج فَلَمَّا نَبَّاَتْ بِهٖ وَاَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ ...... ﴾ (التحریم: ۳) ''جب نبیؐ نے اپنی ایک بیوی کو راز کی ایک بات بتائی' پھر جب اس بیوی نے اس راز کو (کسی اور پر) ظاہر کر دیا اور اللہ نے اپنے نبی کو مطلع کر دیا (کہ آپ کی اہلیہ نے وہ راز فاش کر دیا ہے)''۔ اب قرآن میں یہ تو کہیں نہیں ہے کہ اے نبی! آپؐ کی زوجہ نے آپ کا راز فاش کر دیا ہے!

قرآن حکیم کے یہ تین مقامات وحی خفی کے ثبوت کے لئے دلیل قطعی ہیں' ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اب کوئی انکار کرنے پر اُتر آئے تو کرتا رہے۔ سورج نصف النہار پر چمک رہا ہو اور کوئی اس کا انکار کر دے کہ کوئی سورج نہیں ہے تو آپ کیا کر لیں گے؟ اسے کیسے ثابت کر کے دکھائیں گے کہ سورج موجود ہے؟ اگر کوئی ڈھٹائی پر اتر آیا ہو تو ظاہر بات ہے کہ اس کا کوئی علاج نہیں' لیکن قرآن میں تین مقامات ایسے ہیں کہ جہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ پر صرف وحی جلی یا وحی متلو ہی نہیں آتی تھی' وحی خفی یا وحی

غیر متلو بھی آتی تھی۔ یہ الہام‘ تحدیث‘ خواب یا کسی اور شکل میں اللہ کی طرف سے رہنمائی ہوتی تھی‘ جس کو ہم وحی خفی کہتے ہیں۔ حضور ﷺ کی طرف سے قرآن کی تبیین جو ہمیں سنّت رسول میں ملتی ہے‘ خواہ وہ تواترِ عمل سے ہے‘ خواہ وہ حدیث کے مجموعے کی صورت میں ہے‘ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے تبیین ہے جو اُس نے اپنے نبی کو وحی خفی کے ذریعے سے منتقل کی اور نبیؐ کی زبانِ مبارک سے وہ اُمت کو منتقل ہوئی۔

البیّنہ = رسول + کتاب

قرآن مجید کہتا ہے: ﴿لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ﴾ (البیّنة: ۱) ”جو لوگ بھی مشرکوں میں سے یا اہل کتاب میں سے کفر پر اڑ گئے تھے وہ باز آنے والے نہیں تھے یہاں تک کہ بینہ آ جاتی“۔ یعنی بالکل واضح روشن بات جو اظہر من الشمس ہو‘ آفتاب آمد دلیل آفتاب! اگلی دو آیتوں میں اس ”بیّنہ“ کی تشریح کی گئی کہ رسول اور کتاب مل کر ”بیّنہ“ بنتے ہیں: ﴿رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْا صُحُفًا مُّطَهَّرَةً ۞ فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۞﴾ (البیّنة: ۲‘۳) ”اللہ کی طرف سے ایک رسول جو پاک صحیفے پڑھ کر سنائے جن میں بالکل راست اور درست تحریریں لکھی ہوئی ہوں“۔ گویا رسول اور کتاب ایک وحدت ہیں۔

سورۃ النساء میں فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۞ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ﴾ (آیات ۱۵۰‘۱۵۱) ”یقیناً جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں‘ اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں‘ اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے اور کسی کو نہ مانیں گے‘ اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں‘ وہ سب پکے کافر ہیں“۔ چاہے یہ کتنے ہی بڑے موحد بنے پھرتے ہوں اور اپنے آپ کو کتنے ہی بڑے مسلمان سمجھتے ہوں۔ قرآن حکیم کی رو سے اللہ اور رسول ایک وحدت ہیں‘ اللہ کا

کلام اور رسول کا فرمان ایک وحدت ہے۔

اسی طرح سورۃ الطلاق میں ''ذکر'' کا لفظ آیا ہے۔ وہاں بھی ان دونوں چیزوں کو جمع کیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿قَدْ اَنْزَلَ اللّٰهُ اِلَيْكُمْ ذِكْرًا ۝ رَّسُوْلًا يَّتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مُبَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ﴾ (آیات ۱۰، ۱۱) ''لوگو! دیکھو، اللہ نے تمہاری طرف ایک ذکر نازل کیا ہے، وہ رسول جو تلاوت کر رہا ہے تم پر اللہ کی آیات بینات تا کہ جو لوگ بھی ایمان لائیں اور نیک عمل کریں انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے''۔

اب دیکھئے، ذکر بھی رسول اور آیاتِ بینات ملا کر بنا، بینہ بھی رسول اور اس کے ساتھ آیات بینات ملا کر بنا۔ ان دونوں کا اس طرح چولی دامن کا ساتھ ہے کہ یہ ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہو سکتے، یہ ایک وحدت ہیں۔ یہی دراصل ہمارے دین کی وہ بنیادی حقیقت ہے کہ جس سے آج کے دور میں جدید مادہ پرستانہ وملحدانہ افکار کے زیر اثر مسلمانوں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو بے بہرہ کیا جا رہا ہے۔ ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ؟

اس جدید تعلیم نے بہت بُرے اثرات ڈالے ہیں۔ یہ فتنہ بہت بڑا ہے اور اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ فتنہ انکارِ حدیث یا استخفافِ حدیث ہے۔ اس کے مختلف گریڈز ہیں اور اس کے بے شمار shades ہیں۔ کچھ خالص اہل قرآن ہیں، کچھ ذرا مختلف قسم کے ہیں۔ کسی کے نزدیک نمازیں دو ہیں اور کسی کے نزدیک تین۔ کسی کے نزدیک صرف کرسی پر بیٹھ کر اللہ سے لو لگا لینا ہی نماز ہے، اس کی کوئی معین شکل نہیں ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اُمت کو جمع کرنے والی شے تو سنت تھی۔ یہ محمد رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے کہ آج دنیا میں ڈیڑھ سو کروڑ مسلمان آباد ہیں، اب تو آٹھ ملین مسلمان صرف امریکہ میں ہیں، مگر امریکہ سے لے کر موریطانیہ تک چلے جایئے، کہیں نماز میں کوئی اختلاف ہے؟ اختلاف ہے بھی تو رفع یدین جیسے فروعی مسائل میں ہے، جن سے نماز

باجماعت متاثر نہیں ہوتی۔ شیعہ' سنی' اہلحدیث' بریلوی' دیوبندی' حنفی' مالکی سب ایک جماعت کے ساتھ نماز پڑھ سکتے ہیں۔ اگر کہیں کسی کے نزدیک رکوع کی طرح سجدہ بھی ایک ہوتا تو جماعت میں ایک آدمی تو ایک سجدہ کر کے کھڑا ہو جاتا' جبکہ دوسرا آدمی سجدہ کر رہا ہوتا اور وہ کہتا ؏

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقت قیام آیا!

اس طرح وہ فارمیشن ٹوٹ جاتی۔ کسی کے نزدیک پہلے سجدہ اور پھر رکوع ہوتا تو بھی فارمیشن ٹوٹ جاتی۔ مغرب بعید سے لے کر مشرق بعید تک ایک رکعت کی ترتیب میں قطعاً کوئی فرق نہیں۔ کھڑے ہیں تو سب کھڑے ہیں' رکوع میں گئے ہیں تو سب رکوع میں گئے ہیں۔ رکوع کے بعد کھڑے ہونا ہے تو سب کھڑے ہیں' سجدے میں سب اکٹھے گئے ہیں' پھر سب بیٹھے ہیں' پھر سجدہ کیا تو سب نے کیا' پھر کھڑے ہو گئے۔ یہ سب چیزیں سنت رسول ﷺ کی برکت ہیں' ((صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ)) کا ثمرہ ہیں۔ اگر یہ مرکز ہٹا دیا جائے تو پھر ہر شخص کی اپنی نماز ہوگی جو وہ قرآن سے خود جوڑے گا اور جوڑ کر جو چاہے گا نماز بنا لے گا۔ اس طرح ملت کی وحدت پارہ پارہ ہو کر رہ جائے گی۔ اصل میں وحدت ملی کے یہ دو ستون ہیں۔ ایک حبل اللہ' یعنی اللہ کی کتاب' اور دوسرا سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام!

اَقُولُ قَولی هذا واستغفر الله لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات

فارغ طلبہ کے لئے

یہ ایک اچھا موقع ہے کہ وہ گھر بیٹھے مطالعہ کر کے اپنے اسلامی جنرل نالج میں اضافہ کریں' تفرقوں سے پاک اسلام کو سمجھیں اور اس پر عمل کرنے کا سلیقہ سیکھیں۔ مطالعہ مکمل کرنے کے لئے مدت کی پابندی نہیں ہے اور فیس میں رعایت یا معافی کی بھی گنجائش ہے۔ تفصیلات بلا معاوضہ فراہم کی جائیں گی۔

البلاغ فاؤنڈیشن سرجی میڈ ہسپتال۔ ظفر علی خان روڈ' لاہور

ای میل: anees287@one.net.pk فون: 5714411-18 Ext. 3075

اقتباس از کتاب

''تحریک مجاہدین جنگ بالاکوٹ کے بعد''

سید میر بادشاہ بخاری

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے مؤلف نے یہ کتاب اصلاً بالاکوٹ کے حادثۂ فاجعہ کے بعد جماعت مجاہدین رحمہم اللہ کے باقیات الصالحات کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے تذکرے کے لئے مرتب کی ہے ___ لیکن اس میں ایک تو حضرت اورنگزیب عالمگیرؒ کے انتقال کے بعد مسلم انڈیا میں جو ابتری پیدا ہوئی اور مسلم اقتدار زوال سے دوچار ہوا اس کا تذکرہ نہایت اختصار لیکن حد درجہ جامعیت کے ساتھ آ گیا ہے۔ اور دوسرے تحریک شہیدینؒ کے ساتھ خوانین سرحد کے طرزِ عمل کے ضمن میں بھی عام تاثر کے برعکس ایک نہایت مختصر مگر بہت وقیع وضاحت آ گئی ہے ___ لہٰذا اس کے متعلق مباحث افادۂ عام کے لئے ذیل میں شائع کئے جا رہے ہیں۔ کتاب پر نہ مؤلف کا پتہ درج ہے نہ پبلشر کا۔ ہمیں اس کا ایک نسخہ خان راحت اللہ خان مینیجنگ ایڈوائزر ریکسن ٹوبیکو کمپنی لمیٹڈ مردان سے دستیاب ہوا تھا ___ (ادارہ)

اگرچہ ہمارا موضوع سانحہ بالاکوٹ یعنی ۱۸۳۱ء کے بعد کے واقعات تک محدود ہے اور سید احمد بریلوی شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے جانشینوں کی جدوجہد اور جہاد و قتال سے متعلق ہے، لیکن بے محل نہ ہوگا اگر اس تحریک کے تاریخی پس منظر پر مختصراً کچھ روشنی ڈالی جائے۔

حکومت مغلیہ حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات تک ایک مضبوط حکومت تھی، اور اس سلطنت کے علم کشمیر سے کاویری تک لہرا رہے تھے۔ لیکن اورنگ زیب عالمگیر کی آنکھ بند ہوتے ہی مغل سلطنت کو زوال آنا شروع ہوا۔ حضرت عالمگیرؒ کے بعد اس

کے جانشین نہایت ہی نا اہل اور حد درجہ عیاش تھے۔ وہ کاروبار شہریاری سے بے پرواہ دن رات اپنی عیاشیوں میں مصروف اور رنگ رلیوں میں مست تھے۔ عیاشی اور کاروبارِ حکومت کو چلانا دو متضاد خصلتیں ہیں۔ اس لئے وہ کاروبارِ حکومت چلانے کے قطعاً اہل نہ تھے اور نتیجتاً ''کند ہم جنس با ہم جنس پرواز'' کے مطابق بے غیرت' نالائق اور خوشامدی لوگوں کو دربار میں اونچے اور اہم عہدے دیئے گئے اور قابل' باوقار اور خود دار لوگ دربار کے امور سے بے دخل کئے گئے۔ بادشاہ کے گرد ہر وقت موقع پرست اور ابن الوقت مصاحبین کا ایک جمگھٹا لگا رہتا تھا اور یہی لوگ بادشاہ کے دادِ عیش دینے میں اس کے مدد و معاون بنے رہے۔

چوں مہمانِ خراباتی بعشرت باش باانداں

حکومت کے معاملات جو محنتِ شاقہ اور دماغ سوزی کا مطالبہ کرتے ہیں' ایسے سہل پسند اور عیش پسند بادشاہوں اور امراء و مصاحبین کے بس کا روگ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مرکزیت بحال نہ رہی اور نظامِ حکومت درہم برہم ہوتا چلا گیا۔

بدقسمتی سے محمد شاہ کو جو کہ رنگیلے کے لقب سے مشہور ہوا' ایک طویل دَور تک حکومت کرنے کا موقع ملا۔ یہ شخص حد درجہ عیاش' طوائفوں کا شوقین اور راگ رنگ کا شیدائی تھا۔ عورتوں کی صحبت میں رہنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا' لہٰذا حکومت اور امورِ سلطنت سے بالکل لاپرواہ اور غافل تھا۔ طاؤس و رباب اور شراب و کباب نے اس کو امراء اور گورنروں کے محاسبے سے قطعاً بے پرواہ بنا دیا تھا۔ دُور دراز کے گورنر باغی ہو رہے تھے اور محمد شاہ ''فنون لطیفہ'' کو فروغ اور ترقی دینے میں مشغول تھا۔ مرکز گریز رجحانات بڑھتے گئے اور صوبوں پر مرکزی حکومت کی گرفت روز بروز کمزور ہوتی گئی۔ مرہٹے اور راجپوت دلیر ہوتے گئے اور طاقتور بننے لگے۔ سلطنت کی ایسی منتشر' ناگفتہ بہ اور تباہ کن صورت حال تھی کہ نادر شاہ افشار نے ۱۷۳۹ء میں دہلی پر حملہ کیا اور دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ کئی دنوں تک لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔ حکومت کا نظم و نسق تو پہلے ہی سے رو بہ انحطاط اور زوال پذیر تھا' نادر شاہ کے حملے نے

رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔

اس منتشر صورت حال سے مرہٹوں نے پورا فائدہ اٹھایا اور ان کی تگ و تاز' لوٹ مار اور غارت گری نے بنگال' بہار اور اڑیسہ تک وسعت اختیار کی۔ اور یہاں دربار میں یہ حالت تھی کہ بجائے اس کے کہ مرہٹوں کی ابھرتی ہوئی طاقت کے سدّ باب کے لئے کوئی کارروائی کرتے' وہ ایرانی اور تورانی نزاع میں مشغول اور سرگرم عمل تھے اور ہر گروہ نے دوسرے گروہ کو نیچا دکھانے کے لئے اپنے آپ کو مرہٹوں کا محتاج اور دست نگر بنا دیا تھا۔

نوبت یہاں تک پہنچی کہ رگھوناتھ راؤ اور ملہار راؤ ہولکر نے دہلی پر حملہ کیا' اپریل ۱۷۵۸ء میں پنجاب پر چڑھ دوڑے اور لاہور پر قبضہ کیا۔ ان کامیابیوں کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ مرہٹوں کے حوصلے بڑھ گئے اور وہ ہندوستان سے مسلم تہذیب و تمدن کو ختم کرنے اور اس کی جگہ ہندو تہذیب کو مسلط کرنے کے خواب دیکھنے لگے۔

یہی مایوس کن اور نامساعد حالات تھے جن سے مسلمانانِ ہند دوچار تھے۔ ہر طرف مایوسی ہی مایوسی تھی' اُمید کی کوئی کرن نظر نہ آ رہی تھی۔ ایسے حالات میں جب کہ مسلمانانِ ہند حیران و پریشان تھے' ان کو ایک ایسے صاحب عزیمت اور مسیحا نفس قائد کی ضرورت تھی جو ملت کے تن مُردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دے اور ان کی یہ ضرورت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی شخصیت نے پوری کر دی۔ شاہ صاحبؒ نے مسلمانانِ ہند کے دینی' تہذیبی اور تمدنی ورثہ کو تباہی سے بچانے کے لئے کمر ہمت باندھ لی۔

شاہ صاحبؒ نے علیٰ وجہ البصیرت معلوم کیا کہ اس وقت مسلمانوں کے لئے سب سے بڑا خطرہ مرہٹوں کی روز افزوں بڑھتی ہوئی طاقت کا ہے۔ مسلمانوں کو اس قعر مذلت سے نکالنے کے لئے ان کی نگاہیں اس وقت کے دو عظیم المرتبت اشخاص پر ٹک گئیں۔

ایک ہندوستان کے اندر نجیب الدولہ [1] اور دوسرا ہندوستان سے باہر یعنی احمد شاہ

(۱) یاد رہے کہ نجیب الدولہ کا اصلی نام نجیب اللہ خان تھا۔ وہ مانیری تحصیل صوابی (سرحد) کا رہنے والا قوم کا عمر خیل تھا۔ سابقہ وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب خان اس کی اولاد میں سے تھے۔

ابدالیؒ۔ شاہ صاحب نے ہر دو اکابر کو خطوط کے ذریعے ترغیب دلائی کہ اس نازک وقت میں مسلمانانِ ہند کی امداد کے لئے آئیں۔ شاہ صاحب نے احمد شاہ ابدالی کو جو خط لکھا اس کا اقتباس ملاحظہ ہو۔ ہندوستان میں غیر مسلموں کے غلبہ اور مسلمانوں کے حالات زار لکھنے کے بعد فرماتے ہیں:

> ''اس زمانے میں ایسا بادشاہ جو صاحب اقتدار وشوکت ہو اور لشکر مخالفین کو شکست دے سکتا ہو' دور اندیش اور جنگ آزما ہو' سوائے آنجناب کے اور کوئی موجود نہ ہے۔ یقینی طور پر جناب عالی پر فرضِ عین ہے ہندوستان کا قصد کرنا اور مرہٹوں کا تسلط توڑنا اور ضعفاء مسلمین کو غیر مسلموں کے پنجوں سے آزاد کرنا۔ اگر غلبۂ کفر معاذ اللہ اس انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا زمانہ نہ گزرے گا کہ یہ مسلم قوم ایسی قوم بن جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ ہو سکے۔ یہ بھی ایک بلائے عظیم ہے۔ اس بلائے عظیم کو دفع کرنے کی قدرت بہ فضلِ خداوندی جناب کے علاوہ کسی کو میسر نہیں''۔
>
> (شاہ ولی اللہؒ کے سیاسی خطوط مکتوب بنام احمد شاہ ابدالی)

اپنے طور پر شاہ ولی اللہؒ نے ایک ایسے گروہ کی تیاری کے لئے دعوتی کام کا آغاز کیا جو خود علم و عمل کے پیکر ہوں' دعوتِ اسلامی کے جذبے سے سرشار اور اس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہوں اور اپنی مسلسل تبلیغ و تلقین سے مسلمانوں میں فکر و عمل اور جہاد کی روح کو از سرِ نو زندہ کریں' اور فی الحقیقت ہوا بھی اسی طرح۔ کیونکہ شاہ صاحبؒ نے ایسے ایثار پیشہ افراد کی ایک مضبوط جماعت تیار کی جو بعد کے دور میں کفر و

نوٹ...... شاہ ولی اللہؒ کے خط سے صاف ظاہر ہے کہ احمد شاہ ابدالی اس کی دعوت پر ہندوستان کے مسلمانوں کو مرہٹوں کے جبر و استبداد سے چھڑانے کے لئے آیا تھا اور ہندوستان کے مسلمانوں کے دین و تہذیب کو بچانے کے لئے زمانے کے لحاظ سے دور دراز کے سفر طے کر کے پانی پت پہنچا تھا۔ لیکن قارئین کی معلومات کے لئے یہ لکھنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اتفاق سے مرہٹوں کے توپ خانے اور ایک تربیت یافتہ پیادہ فوج کا سپہ سالار ابراہیم گاردی نامی تھا جس نے فرانسیسی ماہروں سے فن حرب اور نئے قواعد جنگ کی تعلیم پائی تھی اور صرف تنخواہ کی خاطر مسلمان بھائیوں پر گولے برسانے مرہٹوں کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے بڑی مستعدی اور نمک حلالی سے یہ خدمت انجام دی اور اسی میدان میں اپنی جان دی۔

طغیان کے سامنے سینہ سپر ہوئی اور اس کے افراد جہاد و قتال' دیانت و امانت' صبر و ثبات اور عزم و استقلال کے لازوال نقوش صفحہ تاریخ پر مرتسم کر کے اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے۔

شاہ صاحبؒ کی دعوت پر احمد شاہ ابدالی عازمِ ہند ہوئے اور مرہٹوں کی متحدہ و مشترکہ طاقت اور احمد شاہ ابدالی کے درمیان ۱۷۶۱ء کو وہ مشہور اور فیصلہ کن جنگ ہوئی جو پانی پت کی تیسری لڑائی کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے۔ یہ لڑائی اثرات کے لحاظ سے نہایت اہم جنگ ہے' کیونکہ مرہٹوں کی متحدہ طاقت مکمل طور پر ختم ہوئی اور ان کو ایسی شکست ہوئی کہ بعد میں وہ سر نہ اٹھا سکے۔ فوج کے علاوہ مرہٹوں کی تقریباً تمام قیادت یکسر ختم ہوگئی اور تمام مہاراشٹر میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں صف ماتم نہ بچھی ہو۔

اس جنگ کے سیاسی اثرات مسلمان حکمران سمیٹ نہ سکے اور مرہٹوں کی اس شکست فاش سے وہ فوائد حاصل نہ کیے جا سکے جو حاصل کرنا چاہئیں تھے۔ شاہ عالم ثانی کو دہلی لانے کی کوشش کی گئی تاکہ وہ احمد شاہ ابدالی کی موجودگی ہی میں اپنے آپ کو مستحکم کر سکے اور انگریزوں کے حلقہ اثر سے نکل آئے' لیکن وہ آنے پر آمادہ نہ ہوئے اور ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

درحقیقت قوموں کے عروج و زوال کا جو پیمانہ علامہ اقبال نے مقرر کیا ہے وہ درست چلا آ رہا ہے۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر!

اُس وقت کے مغل حکمران شمشیر و سنان کے جوہر کھو چکے تھے اور طاؤس و رباب کے رسیا ہو گئے تھے' عیش و عشرت نے ان کو بے ہمت اور کم حوصلہ بنا دیا تھا' وہ سیاسی بصیرت سے عاری تھے۔ ان میں دین و ملت اور ملک و قوم کی حفاظت و بقاء کا احساس ہی نہ رہا تھا' اور اسلامی تہذیب و تمدن کے تحفظ کی ان کو کوئی فکر نہ تھی۔ لہٰذا پانی پت کی تیسری لڑائی سے ایک دوسری قوم نے عظیم سیاسی فائدہ اٹھایا۔ یہ قوم مسلمانوں اور

ہندوؤں کے مقابلہ میں زیادہ باصلاحیت' باہمت اور بامشقت تھی اور سیاسی طور پر زیادہ بیدار اور ہوش مند بھی تھی۔ یہ تھے انگریز جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے۔

انگریزوں نے حالات کا ٹھنڈے دل و دماغ سے جائزہ لیا اور گہرے غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان کی سیاسیات میں دخل اندازی اور اپنا اثر بڑھانے کا یہی وہ بہترین اور سنہری موقع ہے۔ چنانچہ انہوں نے انہی خطوط پر کام شروع کیا۔ ۱۷۵۷ء میں یعنی جنگِ پانی پت سے ٹھیک چار سال قبل انگریزوں نے بنگال میں پلاسی کے معرکے میں کامیابی حاصل کی تھی جس سے حوصلہ پا کر ان کی نگاہ آز سارے ہندوستان پر تھی۔ اگرچہ انگریزوں کو یہ کامیابی اپنوں کی غداری کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی لیکن کامیابی بہرحال اپنا رنگ دکھاتی ہے اور انگریز اس کامیابی کے بل بوتے پر تمام ہندوستان کو مسخر کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے اور اپنی مشہور زمانہ پالیسی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کو بروئے کار لا رہے تھے۔ یہی حالات تھے کہ شہنشاہِ ہند اور نواب اودھ شجاع الدولہ کو ۱۷۶۴ء میں بکسر کے میدان میں انگریزوں نے شکست دے دی۔ پلاسی اور بکسر کی لڑائیوں کا سیاسی نتیجہ یہ نکلا کہ بنگال کی حکومت انگریزوں کے تابع ہوگئی' شہنشاہِ ہند انگریزوں کا پنشن خوار بن گیا اور نواب ان کے زیر نگیں ہوا' اور اقتصادی نتیجہ یہ نکلا کہ بنگال' بہار اور اڑیسہ کی دیوانی انگریزوں کو مل گئی۔

یہ کامیابیاں ایسی نہ تھیں جو رنگ نہ دکھاتیں۔ انگریز ایک مدبر قوم تھی۔ سیاسی طور پر بیدار مغز' ڈپلومیسی میں طاق' عیاری و مکاری میں یکتا' نہایت شاطر' حالات کو سمجھنے والے اور درست نتائج اخذ کرنے والے تھے۔ سائنٹیفک جنگ کے خوگر' جدید اسلحہ سے مسلح' جدید قواعد جنگ سے آشنا اور آپس میں متحد و منظم تھے۔ اس کے مقابلے میں مسلمان حکمران نااہل' ناعاقبت اندیش' کم ہمت اور آپس میں مشت و گریبان تھے۔ لہٰذا انگریزوں کی شکل میں ہندوستان کے سیاسی افق پر ایک ایسی قوم نمودار ہوئی جنہوں نے آخر کار حکمت و تدبر' جنگ و جدال اور ڈپلومیٹک چالوں سے تمام ہندوستان کو

زیر نگیں کیا۔

چونکہ ہندوستان کے مسلمان صدیوں سے بادشاہی نظام سے منسلک چلے آ رہے تھے' اس لئے ہر مصیبت اور خطرے کے وقت ان کی امیدیں حکمرانوں سے وابستہ ہوتیں' لیکن جب حالات ایسے ہوں کہ حکمران عزم و حوصلہ سے بالکل عاری ہو چکے ہوں تو عام مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہونی ہی تھی۔ وہ حیران و پریشان تھے کہ کیا اور کون سا لائحہ عمل اختیار کریں تاکہ ذلت کے اس خوفناک سمندر سے نکل سکیں۔ ایک طرف مسلمان اس لاینحل الجھن میں گرفتار تھے اور دوسری طرف انگریز مسلمانوں سے ہزار سالہ صلیبی جنگوں کی ذلت آمیز شکست کا انتقام لینے پر تلے ہوئے تھے اور اس انتقام کو اپنے فطری اور منطقی انجام تک پہنچانے کے لئے انگریزوں کے لئے اس موقع سے زیادہ سنہری اور موافق موقع اور کوئی نہ تھا۔

اس کے برعکس ہندو تھے جو ہندوستان میں ایک ہزار سال تک مسلمانوں کے غلام رہ چکے تھے' ان کے لئے انگریزوں کا وجود غنیمت تھا' لہٰذا وہ انگریزوں سے مل کر اپنے سابق حکمرانوں اور محسنوں یعنی مسلمانوں کے خلاف صف آراء ہوئے۔ انگریز اپنی دُور اندیشی' تدبر' مکر اور فریب کے بل پر اور ہندوؤں کے تعاون سے ملک پر چھا رہے تھے اور مسلمانوں کے دین' تہذیب' تمدن اور ثقافت کو نیست و نابود کرنے کے لئے لمبی منصوبہ بندیاں کر رہے تھے۔

ایسے مایوس کن حالات تھے کہ مسلمان مفکرین نے مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے حقیقی اسباب پر غور کرنا شروع کیا۔ مسلمانوں کے اندر شاہ ولی اللہؒ کے تیار کردہ گروہ کے علماء اور مصلحین موجود تھے اور انہوں نے اپنی تقریروں اور تحریروں سے عام مسلمانوں میں احیائے اسلام کا خوابیدہ جذبہ از سرنو بیدار کیا' ان کو اسلام کی انقلابی تحریک اور دعوت سے روشناس کرایا اور اپنی عظمت رفتہ کو حاصل کرنے' اپنے دین' تہذیب اور تمدن کو بچانے اور انگریزوں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لئے ایک جہاد مسلسل کے لئے تیار کیا۔ نہایت صبر آزما کوششوں سے مسلمانوں کے دلوں

سے غلط نظریات و رسمیات مٹا کر ان کو دوبارہ ایک ایسا بنیانِ مرصوص بنایا جس پر استوار اخوت کو کوئی لسانی' وطنی اور لونی اختلافات گزند نہ پہنچا سکیں۔

یہ شاہ ولی اللہؒ اور اس کے چاروں عظیم المرتبت بیٹوں شاہ عبدالعزیز' شاہ رفیع الدین' شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی رحمہم اللہ اور شاہ ولی اللہؒ کے فکر کے دوسرے علماء اور مصلحین ہی تھے جن کی رشد و ہدایت اور ان تھک کوششوں سے مسلمانوں کے طبقہ میں سے ایسے باحوصلہ' باہمت اور صاحبانِ عزم و تقویٰ افراد پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے آخری سانس تک شریعت اسلامی کے نفاذ اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو مغربی یلغار سے بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔

اگرچہ انگریزوں کی ہندوستان میں روز افزوں بڑھتی ہوئی طاقت کو اور اس کے مستقبل کے ممکنہ نتائج کو سلطان ٹیپو شہید نے بھی اچھی طرح محسوس کیا تھا' وہ جانتے تھے کہ انگریز ہندوستان کے مالک بننا چاہتے ہیں۔ وہ فن سپہ گری میں طاق اور عظیم مدبر تھے۔ میسور کی پہلی جنگ میں کرناٹک پر حملے کے دوران ٹیپو سلطان نے پہلی مرتبہ اپنے باپ کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف جہاد کیا تھا۔ انگریزوں کو بھی جنرل میتھیوز کی شکست کے بعد ۱۷۸۴ء کا معاہدہ بنگلور یاد تھا جس کو ہندوستان میں انگریزوں کی انتہائی شرمناک شکست سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سلطان ٹیپو شہید نے اپنی حد تک اس خطرے کا سدّباب کرنے کی پوری پوری کوشش کی' لیکن اپنوں کی غداری اور اپنے ہی افسروں کی نمک حرامی نے سلطان شہید کے عزائم پر پانی پھیر دیا اور وہ ۴ رمئی ۱۷۹۹ء کو سرنگا پٹم میں شہید ہوئے۔ اور بقول ڈاکٹر اقبال ؎

اندرونِ او دو طاغوتِ کہن
روح قومے کشتہ از بہر دو تن!
جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن!
ناقبول و نا امید و نامراد
ملتے از کارِ شاں اندر فساد! (جاوید نامہ)

سلطان ٹیپو شہید کی ناکامی نہایت اہم اور دُور رس نتائج پر منتج ہوئی۔ انگریزوں کو ایک اولوالعزم، شجاع اور مدبر دشمن سے نجات ملی اور نہایت آسانی سے چند سالوں میں تقریباً تمام ہندوستان پر مسلط ہو گئے۔ ہندوستان کے نواب، راجے اور حکمران ایک ایک کر کے ان کے سامنے سرنگوں ہوتے گئے۔ یہ وقت تھا کہ مسلمان مفکرین نے مکمل طور پر محسوس کیا کہ اب مسلمانوں کے دین، تہذیب اور تمدن کو بچانے کے لئے مسلمان حکمرانوں پر نہ کوئی بھروسہ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان سے امید کی جا سکتی ہے، اور نہ ہی وہ اس عظیم کام کا بیڑا اٹھانے کے اہل ہیں، کیونکہ وہ عیاشیوں میں مست اور قائدانہ صلاحیتیں کھو چکے تھے۔ لہٰذا مسلم مفکرین کے سامنے واحد راستہ یہی تھا کہ مسلمانوں کو اس قعرِ مذلت سے نکالنے کے لئے ایک عوامی اسلامی تحریک برپا کرنے کی کوشش اور جدوجہد شروع کریں۔

اس قسم کی پہلی اسلامی تحریک سرزمین بنگال سے مولانا شریعت اللہ نے شروع کی، جو فرائضی تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ مولانا شریعت اللہ (۱) نے مسلمانانِ بنگال کے عقیدے اور عمل کی اصلاح کے ساتھ ساتھ ان میں انگریزوں کے خلاف جذبہ جہاد کو ابھارنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے اور تحریک کو مزید جاندار بنانے کے لئے انہوں نے انگریزوں کی حکومت کو اسلام دشمن قرار دے کر ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا۔

(۱) مولانا شریعت اللہؒ ضلع فرید پور (بنگال) کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مزید حصولِ تعلیم کے لئے مکّہ معظمہ تشریف لے گئے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد جب واپس آئے اور مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت اور ہندو زمینداروں کی مسلمان کاشت کاروں کے ساتھ زیادتیاں دیکھیں کہ ہندو زمیندار دُرگا (پوجا) اور دوسرے مشرکانہ رسوم کے لئے مسلمانوں پر جبراً ٹیکس عائد کرتے، یہاں تک کہ مسلمانوں کو رسوا کرنے کے لئے ایک ہندو زمیندار کشن رائے پورنا نے اس کو داڑھی ٹیکس (Beard Tax) کا نام دیا۔ ان تمام زیادتیوں کو انگریزوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ ان حالات میں آپ نے عام مسلمانوں کی دینی اصلاح کے لئے ایک ہمہ گیر تحریک شروع کی جو کہ فرائضی تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ آپ کی وفات کے بعد تحریک کی قیادت آپ کے بیٹے محمد حسن نے سنبھالی۔

اس تحریک نے مسلمانوں میں احیائے اسلام کے لئے ایک زبردست اور پختہ جذبہ پیدا کیا۔ چنانچہ دادو میاں کی سرگرمیوں کو کچلنے کے لئے انگریزوں کو کئی بار سخت اقدامات کرنے پڑے۔

مولانا شریعت اللہؒ نے اعلان کیا کہ چونکہ بنگال میں غیرمسلموں کی حکومت قائم ہوچکی ہے اس وجہ سے مسلمانوں پر اب جمعہ اور عیدین کی نماز باجماعت فرض نہیں ہے' تاوقتیکہ مسلمان اس کافر حکومت کو ختم کر کے اسلامی حکومت قائم نہ کر لیں ۔ نیز دارالحرب قرار دینے کا مطلب یہ بھی تھا کہ مسلمان عملاً حالت جنگ میں ہیں۔

یہ پہلی عوامی اسلامی تحریک اور جدوجہد تھی جو ایک غیرملکی کافر حکومت کے خلاف عوامی سطح پر برپا کی گئی تھی۔ یہ تحریک اتنی فعال تھی اور اس کا تنظیمی ڈھانچہ اتنی مضبوط بنیادوں پر استوار ہوا تھا' اور اپنے اثرات کے لحاظ سے اتنی ہمہ گیر تھی کہ اس تحریک نے ایک قسم کی متبادل حکومت قائم کی۔ اور چونکہ وہ برٹش حکومت کو ناجائز تصور کرتے تھے اس لئے اپنے مقدمات کے فیصلوں کے لئے انگریزی عدالتوں کا بائیکاٹ کیا۔ یہ امر واقع ہے اور اس زمانے کا ریکارڈ اس پر شاہد ہے کہ جہاں جہاں بھی یہ تحریک زیادہ قوی اور بااثر تھی وہاں پر مسلمانوں کا ایک معاملہ بھی تصفیہ کے لئے برٹش عدالت میں نہیں گیا۔ فی الحقیقت اس تحریک نے مسلمانوں میں احیائے اسلام کے لئے ایک زبردست جذبہ پروان چڑھایا۔ (اس تحریک کا اثر اتنا پائیدار تھا کہ بنگال میں مسلمان قیامِ پاکستان تک جمعہ اور عیدین کی نمازیں باجماعت نہیں پڑھا کرتے تھے۔)

اس کے بعد دوسری تحریک جو کہ ہمارے موضوع کے ساتھ متعلق ہے' سید احمد شہید بریلویؒ کی تحریک مجاہدین ہے۔ یہ تحریک بھی شاہ ولی اللہؒ کی کوششوں اور ان کے تجدیدی کارناموں کی بدولت معرضِ وجود میں آئی جس کا مقصد وحید احیائے اسلام تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے عوام میں علم و عمل کا جذبہ ابھار کر جہاد کا سپرٹ پیدا کرنا تھا۔ سید صاحبؒ نے ایک ایسی ہمہ گیر تحریک برپا کی جس کے اثرات قیامِ پاکستان تک باقی رہے یہاں تک کہ ۱۹۴۸ء کی جنگ کشمیر میں مجاہدین کے آخری امیر

اور صدر المہام شہزادہ برکت اللہ نے بنفس نفیس حصّہ لیا۔ اس تحریک نے مسلمانوں میں جہاد و قتال، عزم و استقلال اور ایثار و قربانی کی ایک ایسی روح پھونک دی جس کو دیکھ کر دنیا اور دوست و دشمن سب دنگ رہ گئے کہ ایسے دَورِ زوال و انحطاط میں ایسی عظیم قربانیاں پیش کی جا سکتی ہے۔

سید صاحبؒ نے جب اپنی تحریک کو ہندوستان کے طول و عرض میں پھیلایا اور اپنے ساتھیوں کو جہاد فی سبیل اللہ کے لئے کمربستہ کیا تو سب سے پہلے صوبہ سرحد سے انہوں نے اپنے عملی جہاد کی ابتداء کی۔ وجہ یہ تھی کہ سکھ سالم پنجاب اور صوبہ سرحد کے بیشتر حصّوں پر قابض تھے اور اپنی بربریت اور وحشیانہ سلوک کی وجہ سے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کئے ہوئے تھے۔ سید صاحبؒ نے پنجاب اور صوبہ سرحد کے مسلمانوں کو سکھوں کے ظلم و جبر اور سفاکانہ سلوک سے نجات دلانے کے لئے ایک طویل اور دشوار گزار مسافت اختیار کی۔ وہ راجپوتانہ کے ریگستان کو عبور کرتے ہوئے وارِدِ افغانستان ہوئے اور افغانستان سے صوبہ سرحد میں داخل ہو کر جہاد کا آغاز کیا۔ سید صاحب اور اس کے رفقاء نے ایک مقدس نصب العین کی خاطر اپنے اہل و عیال، عزیز و اقارب اور مال و متاع کو چھوڑ کر اور اپنے گھروں سے اتنی دُور جا کر جہاں ہر طرف خطرے ہی خطرے تھے، اعلائے کلمۃ اللہ اور مظلوم مسلمانوں کی دادرسی اور امداد کے لئے ایک مسلسل جدوجہد کی اور وہ سب انتہائی نامساعد و ناموافق حالات میں بھی عزم و ثبات کے کوہ گراں بنے رہے۔ ع

چوں راہ حرم باشد سہل است بیابانہا

اس وقت سید صاحبؒ کی حیات میں اس کی جدوجہد اور شہادت تک کے حالات کا احاطہ کرنا پیشِ نظر نہیں۔ یہ تمام کارہائے نمایاں تحریری شکل میں موجود ہیں اور یہ کارنامے شہرتِ عام اور بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں۔ بہرحال ۱۸۳۱ء میں سید احمد شہیدؒ، شاہ اسماعیل شہیدؒ اور ارباب بہرام خان شہیدؒ نے مع اکثر رفقاء بالاکوٹ کے میدانِ کارزار میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

سودا قمارِ عشق میں خسرو سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا!
کس مُنہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے رو سیاہ تم سے تو یہ بھی نہ ہو سکا!

یہاں پر اگر ایک ضروری وضاحت نہ کروں تو اپنے فرض میں کوتاہی کے مترادف ہوگا۔ اور وہ یہ کہ مولانا غلام رسول مہر مرحوم نے جو کتاب ''سیرت سید احمد شہید'' کے نام سے لکھی ہے' اس کے پڑھنے سے ایک قاری کے دل میں صوبہ سرحد کے لوگوں کے لئے ایک جذبۂ نفرت پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ اس وجہ سے کہ مہر صاحب نے صوبہ سرحد کے متعلق ایک ایسے تصور کو ابھارنے کی کوشش کی ہے کہ اس صوبہ میں بس غدار ہی غدار بستے ہیں اور سید احمد شہیدؒ کی تحریک کی ناکامی انہی پٹھانوں کی غداریوں کے طفیل ہے۔ لیکن فی الحقیقت مہر صاحب نے صرف یک طرفہ تصویر پیش کی ہے۔ صوبہ سرحد میں اگر ہنڈ کا خادی خان (خادی خان ہنڈ تحصیل صوابی کا خان تھا) بعد میں مخالف ہوا ہے تو خان زیدہ فتح خان اور خان پنجتار فتح خان تو سید صاحب کے رفقاء سے تھے۔ پشاور کی طرف سے سلطان محمد خان اور یار محمد خان درّانی اگر دشمن بن گئے تھے تو اسی پشاور کے تہکال کے ارباب بہرام خان نے تو بالاکوٹ میں سید صاحب کے ساتھ ہی جامِ شہادت نوش فرمایا تھا۔ اور یہ بات بھی کسی وضاحت کی محتاج نہیں کہ فتح خان زیدہ' فتح خان پنجتار اور ارباب بہرام خان تنہا نہ تھے' بلکہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی فوج اور لشکر تھا اور ان سب نے مع اپنے لشکر کے سید صاحب کی رفاقت کا حق کما حقہ' ادا کیا تھا۔ اگر کچھ مولوی مخالف تھے تو آخر کوٹھا (تحصیل صوابی) کے سید امیرؒ جیسے جید علماء اور ان کے تلامذہ بھی تو سید صاحب کے شریک کار و شریک جہاد تھے۔ اس کے علاوہ ستھانہ اور ملکا کے سادات کا خاندان بھی تو صوبہ سرحد ہی کا تھا۔ کیا وہ آخر دم تک مجاہدین کے ساتھ نہ تھے اور سید صاحب کی شہادت کے بعد ستھانہ اور ملکا کئی بار جلائے نہ گئے؟ کیا منگل تھانے کے سادات کی مجاہدین کے ساتھ رفاقت کی وجہ سے منگل تھانے کو ڈائنا

مائٹ سے ملبے کا ڈھیر نہ بنایا گیا تھا؟ آخر غدار کس علاقے میں نہ تھے؟ کیا پنجاب' بنگال' دکن اور ہندوستان کا طول وعرض ان کے وجود سے خالی تھا؟ اور کیا اب خالی ہے؟ اگر صوبہ سرحد کے قبائل مجاہدین کے ہاتھوں میں ہاتھ نہ دیتے اور ان کی مدد نہ کرتے تو کیا ان کے لئے یہ ممکن تھا کہ ۱۹۴۸ء تک صوبہ سرحد میں مقیم رہتے؟ اور آج بھی بچے کھچے مجاہدین مقیم ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہر لڑائی میں جذبہ ابھارنے کا کام مجاہدین نے کیا ہے اور ہر جنگ کی روحِ رواں یہی لوگ تھے۔ لیکن مقامی قیادت نے بھی اس سلسلہ میں خاصا کام کیا ہے اور اس وجہ سے مقامی آبادی نے ان کی دعوت پر لبیک کہہ کر خلوصِ دل سے جنگ کی ہے۔ ان تمام جنگوں میں جیسے کہ ریکارڈ سے واضح ہے' اکثریت مقامی لوگوں کی ہوا کرتی تھی۔ کیا جنگ امبیلہ میں شہزادہ سید مبارک شاہ مورچہ زن نہ تھا؟ بونیر کے لوگ لڑائی میں شریک نہ تھے؟ وادیٔ چملہ' حسن زئی' انمانزئی' چغرزئی اور مداخیل نے اس جنگ میں حصہ نہ لیا؟ سوات' دیر اور باجوڑ تک کے لوگ اس جنگ میں شریک نہ تھے؟ یہ موقع ان تمام واقعات کے احاطہ کا نہیں صرف ضمناً کچھ باتیں عرض کی گئیں۔ آئندہ صفحات کے مطالعہ سے خود بخود واضح ہو جائے گا کہ مقامی آبادی نے ہر جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

دوسری بات جو کہنی مناسب معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ پٹھانوں کے بعض رواج صدیوں کے استمرار کی وجہ سے ان میں ایسے رائج ہو گئے تھے کہ وہ عرف عام میں قانونِ رواجی (common law) کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ ان کو ترک کرنا وقت کے لحاظ سے پٹھانوں کی انا اور وقار کے منافی تھا۔ سید صاحب شہید نے اس معاملے میں تدریج کی حکمت عملی کو ملحوظ نہ رکھا اور اس وجہ سے بعض لوگ مخالف ہو گئے' کیونکہ وہ یک دم تبدیلی کے لئے ذہنی طور پر تیار نہ تھے۔

سانحہ بالاکوٹ کے بعد سید شہیدؒ کے بچے ہوئے رفقاء جو کہ دو اڑھائی ہزار کی

(۱) یہ وہی ستھانہ ہے جو کہ سادات ستھانہ وملکا کا گاؤں تھا۔ سادات کا یہ خاندان ستھانہ کی مسمارگی کے بعد ملکا میں بس گیا تھا۔ ستھانہ پر کرنل ایڈی نے ایک کتاب لکھی ہے۔ کرنل ایڈی بطور جونیئر افسر جنگ امبیلہ میں شریک تھا۔ (Sithana Col. Adye)

تعداد میں تھے، گھنے جنگلوں، سنگلاخ پہاڑوں اور تیز دریاؤں کو عبور کرتے ہوئے آخر کار علاقہ بونیر میں موضع تختہ بند پہنچ گئے اور وہاں پر مقیم ہوئے۔ ان کی قیادت مولوی ولایت علی خان اور مولوی عنایت علی خان نے سنبھالی۔ یہ دونوں بھائی تھے اور پٹنہ کے رہنے والے تھے اور اسی وجہ سے بعد میں پٹنہ ہندوستان میں تحریک کا مرکز بن گیا۔ تختہ بند میں کچھ عرصہ قیام کے بعد ساداتِ (۱) ستھانہ کی دعوت پر انہوں نے بونیر چھوڑ دیا اور ستھانہ میں آباد ہو گئے۔ اس وقت ان کی تعداد گھٹ کر تین سو رہ گئی تھی، کیونکہ ان میں اختلافِ رائے کی وجہ سے کچھ ساتھی واپس ہندوستان چلے گئے۔ ان کا سرغنہ مولوی کرامت علی جونپوری تھا جنہوں نے دینی تبلیغ اور معاشرتی اصلاح کے لئے بنگال اور ہندوستان کے دوسرے حصّوں میں نہایت جوش وخروش اور جذبے سے کام کیا۔

ستھانہ پہنچ کر مولوی ولایت علی خان اور مولوی عنایت علی خان نے جہاد کو زندہ رکھنے کے لئے مسلسل اور انتھک کوشش جاری رکھی اور اس مقصد کے حصول کے لئے دونوں بھائیوں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ ایک طرف یہ سرحد میں عملی جہاد کر رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مولوی عنایت علی خان نے نمایاں کارکردگی دکھائی۔ جس کا حوالہ کرنل آر۔جی ٹیلر نے اپنی رپورٹ بابت امبیلہ میں مولوی عبداللہ خان کے ذکر میں بایں الفاظ کیا ہے:

> *"He (Abdullah Khan) was the nephew of that Maulvi Inayat Ali Khan who gave so much trouble in 1857 at Naringi and was a man of good ability." (Expeditions. p:120)*

> ''عبداللہ خان اس مولوی عنایت علی خان کا بھتیجا تھا جس نے ۱۸۵۷ء میں نارنجی کے مقام پر بے انتہا مشکلات پیدا کیں اور وہ بہت اچھی صلاحیتوں کا مالک تھا''۔

مولوی ولایت علی خان ۱۸۵۲ء میں فوت ہوئے اور مولوی عنایت علی خان ۱۸۵۸ء میں فوت ہوئے۔ ان کے بعد مولوی عبداللہ خان نے مجاہدین کی کمان سنبھالی۔ یہ مولوی ولایت علی خان کے بیٹے اور مولوی عنایت علی خان کے بھتیجے تھے۔ آپ ۱۹۰۲ء تک مجاہدین کے قائد رہے اور ان کی ساری عمر صوبہ سرحد میں گزری۔ اس

تمام عرصہ میں وہ حالتِ جنگ میں رہے اور اس تمام عرصہ میں ایک لمحہ بھی ایسا نہ تھا کہ یا تو آپ انگریزوں کے خلاف مصروفِ جہاد نہ ہوں یا عملاً قتال میں نہ ہوں۔

مجاہدین کی ساری عمر عملاً جہاد سے عبارت تھی اور مسلمانوں کے خلاف جو کارروائی اور جو سازش انگریز کرتے یا بناتے رہے مجاہدین نے اس کے سدّ باب کے لئے ہمہ جہتی کوشش کی ہے۔

جب ۱۸۴۶ء میں انگریزوں نے سازشی طور پر کشمیر کا سودا ڈوگرہ راجہ گلاب سنگھ کے ساتھ پچھتر لاکھ میں طے کیا تو مولوی ولایت علی خان نے اس خطرے اور اس کے مستقبل کے اثرات کو اپنی مؤمنانہ فراست سے محسوس کیا۔ چنانچہ انہوں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ایک بہت بڑا جرگہ ستھانہ میں طلب کیا اور اس جرگہ میں کشمیر کو ڈوگرہ راجہ کے تسلط سے آزاد کرانے کا متفقہ فیصلہ ہوا۔ سید اکبر شاہ ساکن ستھانہ کی امارت میں ایک متوازی حکومت قائم کی گئی۔ گلاب سنگھ ان واقعات سے آنکھیں کیسے بند رکھ سکتا تھا اور انگریز اس سے کیسے غافل ہوسکتا تھا۔ وہ فوراً حرکت میں آئے اور اتحادیوں کے ٹھکانوں پر حملے شروع کئے۔ کئی ایک لڑائیاں ہوئیں۔ ۱۸۴۷ء میں ایگنیو (Agnew) اور لومسڈن (Lumsden) کی فوجوں کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا۔ اس طرح ایبٹ (Abbot) کی فوجوں کو بھی نقصان اٹھانا پڑا اور جو فوج اینڈرسن (Anderson) اور جھنڈا سنگھ کی قیادت میں ۱۸۴۸ء میں لڑی ان کا بھی یہی حشر ہوا۔ لیکن آخر کار انگریزوں کی ڈپلومیسی غالب آ گئی۔ اتحاد ٹوٹ گیا۔ مولوی ولایت علی خان اور مولوی عنایت علی خان گرفتار ہوئے اور لاہور بھیجے گئے۔ بعد میں ضمانت پر رہا ہو گئے، لیکن کچھ دنوں کے بعد دونوں بھائی پھر کسی طریقہ سے ستھانہ پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ مولوی ولایت علی خان کی وفات کے بعد مولوی عنایت علی خان نے کسی جنگی مصلحت کی خاطر اپنا ہیڈکوارٹر ستھانہ سے تبدیل کر کے علاقہ خدوخیل کے منگل تھانہ میں منتقل کیا۔

ڈاکٹر ڈبلیو ہنڈ، ڈبلیو[1] ہنٹر اپنی مشہور کتاب ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' میں

(۱) ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر سرسید احمد خان کا تبصرہ ''ہنٹر پر ہنٹر'' کے نام سے اقبال اکیڈمی لاہور نے =

رقم طراز ہے:

''۱۸۴۷ء میں سرہنری لارنس نے یہ کارروائی قلم بند کی کہ مولانا ولایت علی اور عنایت علی پنجاب میں ''غازی دین'' اور ''مجاہد اسلام'' کے لقب سے مشہور ہیں۔ان کو اپنے مکانوں میں نظر بند رکھا جائے۔پٹنہ کے مجسٹریٹ نے ان سے ضمانت لی اور جماعت کے دوسرے دولت مند ارکان سے بھی ''نیک چلنی'' کے مچلکے لئے۔لیکن ۱۸۵۰ء میں ان کو جنوبی بنگال کے ضلع راجشاہی میں بغاوت کی تبلیغ کرتے ہوئے پایا جاتا ہے' جہاں ان سے حفظ امن کے لئے ضمانتیں لی گئیں اور دوبارہ تبلیغ کرنے کی وجہ سے ان کا دومرتبہ ضلع سے اخراج ہوا''۔

''۱۸۵۱ء میں سید صاحب کے یہی خلفاء جو اپنے شہر میں نظر بند تھے' سرحد پر بغاوت پھیلانے کی تبلیغ کرتے ہوئے پٹنہ میں پائے گئے۔۱۸۵۲ء میں ان کو اپنی کوشش میں بہت کامیابی ہوئی۔آدمی اور روپیہ ستھانہ کیمپ کثرت سے بھیجے گئے اور پنجاب کے حکام نے ہماری فوجوں سے ان کی ایک باغیانہ خط وکتابت پکڑی۔ان کے پیشواؤں نے ہماری چوتھی فوج سے ساز باز کرنے کی بڑی مشاقی سے کوشش کی جو راولپنڈی میں باغیوں کے کیمپ سے بہت قریب ٹھہری ہوئی تھی اور اس رجمنٹ کا جز تھی جو ہمارے صوبہ پر حملہ کرنے کی وجہ سے ان کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے بھیجی گئی تھی''۔

''خطوط سے ثابت ہوتا ہے کہ بنگال سے باغیوں کے کیمپ کو آدمی اور اسلحہ بھیجنے کے لئے ایک باقاعدہ ادارہ قائم ہے۔اسی زمانہ میں ۱۹/اگست ۱۸۵۳ء کو پٹنہ کے مجسٹریٹ نے رپورٹ کی کہ باغی جماعت اور باغیانہ خیالات ترقی پر ہیں۔انگریزی صوبہ کے اس دارالسلطنت (پٹنہ) کے خاص باشندے علانیہ بغاوت کی تبلیغ کرتے ہیں۔پولیس بھی ان سے ملی ہوئی ہے اور ان کے ایک سردار (مولوی احمد اللہ صاحب) نے اپنے مکان میں سات سو آدمیوں کے ایک جلسہ میں اعلان کیا کہ اگر مجسٹریٹ کی طرف سے مزید خانہ تلاشی ہوئی تو وہ ہتھیاروں سے مقابلہ کریں گے۔حکومت برطانیہ اب زیادہ دنوں تک اپنے

= اردو میں شائع کیا ہے۔ڈاکٹر ہنٹر نے Imperial Gazipere of India بھی لکھی ہے جو کئی جلدوں میں ہے۔

علاقہ میں ایک باغیانہ ادارہ کی طرف سے چشم پوشی نہیں کر سکتی تھی۔۱۸۵۲ء کے فصل خزاں میں لارڈ ڈلہوزی نے دو اہم کارروائیاں قلمبند کیں۔ انہوں نے اندرونی ادارہ کی پوری نگرانی اوران سرحدی قبائل کے خلاف مہم بھیجنے کی ہدایت کی جن کی کافروں کے ساتھ وہمی نفرت کو ہندوستانی جنونیوں نے ہوا دے کر مشتعل کر دیا تھا۔ اسی سال انہوں نے ہمارے حلیف امب کے رئیس پر حملہ کیا اور ہم کو ایک برطانوی فوج اس کی امداد کے لئے بھیجنی پڑی۔ ۱۸۵۳ء میں ہمارے متعدد دیسی سپاہی باغیوں کے ساتھ خط و کتابت کرنے کے جرم میں ماخوذ ہوئے''۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور مجاہدین

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہندوستان کے طول وعرض میں سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے سرکردہ لوگ انتہائی فعال نظر آتے ہیں۔ جنرل بخت خان جن کا کردار جنگ آزادی میں نہایت نمایاں ہے' وہ بھی جماعت مجاہدین سے متعلق تھے' کیونکہ بہادر شاہ ظفر کے مقدمہ کے دوران ان کو ''وہابی العقیدہ'' بتایا گیا ہے اور وہابی کا لفظ ان دنوں میں سید صاحب اور اس کے ہم خیال علماء کے لئے انگریزی دستاویزات و تصنیفات میں ایک مروجہ لفظ تھا۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب بھی اس امر کے لئے کافی دلیل ہے۔ اور بقول ڈاکٹر ہنٹر وہابی اور غدار مترادف الفاظ تھے۔ مولانا ولایت علی خان اور مولانا عنایت علی خان بھی سید صاحبؒ ہی کی تحریک کے مجاہد تھے۔ مولانا عبدالجلیل علی گڑھی جنہوں نے علی گڑھ میں برطانوی استعمار کا نہایت بے جگری سے مقابلہ کیا تھا' وہ بھی سید احمد شہیدؒ کے خلفاء میں سے تھے۔ عظیم اللہ خان اور وزیر خان بھی اسی تحریک سے متاثر اور اس کے ساتھ متعلق تھے۔ علماء میں سے مولانا احمد اللہؒ' حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ' مولانا فیض احمد بدایونیؒ' مولانا رشید احمد گنگوہیؒ' مولانا محمد قاسم نانوتویؒ' مولانا فضل حق خیر آبادیؒ' وغیرہ اسی تحریک کے گل ہائے سرسبد تھے۔ جنگ امبیلہ کے بعد تحریک کے متعدد سرکردہ افراد پر مقدمے بنائے گئے۔ ان کا نام بھی ''وہابی مقدمے''

(Wahabi Trial) ہے۔ جس سے صاف طور پر ثابت ہے کہ جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی پشت پر تحریک مجاہدین ہی کے صاحبانِ عزیمت کی سرگرمیاں تھیں۔ اگر ہندوستان میں تحریک مجاہدین کی سرگرمیاں جاری تھیں تو صوبہ سرحد میں بھی اس تحریک کے علم بردار نہایت ہی سرگرم عمل رہے۔

مولوی عنایت علی خان اس دوران مسلسل جہاد کے لئے تبلیغ کرتا رہا۔ اور یہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ مردان میں نمبر ۵۵ رجمنٹ نے بغاوت کر دی۔ اس کے علاوہ مولوی عنایت علی خان نے کئی ایک اعلانات جاری کیے جس کے ذریعے یوسف زئیوں کو اس بات پر آمادہ کرنا مطلوب تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی شروع ہوتے ہی نمبر ۵۵ رجمنٹ نے مردان میں بغاوت کر دی۔ وہ اپنے ساتھ اسلحہ لے کر قریب کے پہاڑوں کو چلے گئے اور نارنجی کے مقام پر مقیم ہوئے۔ کیپٹن جیمز کو پشاور پہنچتے ہی یوسف زئیوں کی طرف بھیجا گیا۔ مولوی عنایت علی خان لوگوں کو جہاد پر آمادہ کرنے کے لئے مصروفِ عمل تھے۔ اس مقصد کے لئے مولوی عنایت علی خان نے فوجیوں کو کئی ایک خطوط لکھے جن میں سے بعض پکڑے گئے۔ جن کے متعلق پنجاب گورنمنٹ ریکارڈ' غدر کی رپورٹوں کا مندرجہ ذیل حوالہ کافی ثبوت مہیا کرتا ہے:

"The most rancorous and seditious letters had been intercepted from Mohammadan bigots in Patna. Thanisar to Naik Karimullah and other soldiers of 64 infantry. The letters alluded to a long series of correspondence that had been going on through those men of 64 Native infantry with the Hindustani fanatics in Swat and Sithana mentioned in para 8 of this letter.[(1)]

''۶۴ رجمنٹ کے نائیک کریم اللہ اور دوسرے فوجیوں اور مسلمان متعصبین کے درمیان نہایت معاندانہ اور باغیانہ خطوط پکڑے گئے۔ ان خطوط میں اس طویل خط و کتابت کی طرف اشارہ تھا جو ۶۴ دیسی رجمنٹ کے لوگوں کے سوات اور ستھانہ کے ہندوستانی جنونیوں کے ساتھ تھا جس کا ذکر اس خط کے پیراگراف ۸

(1) Punjab Govt. Records- mutiny reports, Vol.VIII, Part II. F.141.

میں کیا گیا ہے''۔

اور ظاہر ہے کہ ان دنوں سوات اور ستھانہ میں مجاہدین کی قیادت مولوی عنایت علی خان کے پاس تھی۔ یہ خطوط اگر چہ بہت ہی پوشیدہ رکھے جارہے تھے لیکن کسی نہ کسی طریقہ سے افسروں کو ان کا پتہ لگ ہی گیا۔ اور ظاہر ہے کہ کسی غداری کی وجہ سے ان خطوط کا راز فاش ہوا ہوگا۔ اس کے نتیجہ میں کریم اللہ پر مقدمہ چلا اور ان کو پھانسی دی گئی۔ جس شخص نے یہ خط لکھا تھا اس کو توپ سے اڑایا گیا۔

اسی طرح ۱۹رمئی ۱۸۵۷ء کو مسٹر ویک فیلڈ (Wake Field) نے ایک فقیر اپنے گھر کے پاس دیکھا اور اس کو گرفتار کیا۔ اس سے چھیالیس نئے روپے برآمد ہوئے۔ فقیر نے کہا کہ یہ اس نے ۲۴ دیسی رجمنٹ میں خیرات مانگ کر جمع کئے ہیں۔ فقیر کے پاس سرے کی تھیلی تھی جس میں ایک دوسری تھیلی بھی برآمد ہوئی۔ اس تھیلی سے ایک خط ملا جو کہ محمد نعیم کی طرف سے تھا۔ نویسندہ اور مکتوب الیہ کے نام فرضی تھے جو کہ راز کی خاطر تھے۔ فقیر نے کہا کہ یہ خط پرانا ہے۔ اس نے زمین سے نسوار کے لئے اٹھایا ہے' لیکن اس پر کوئی نشان پرانے ہونے یا نسوار کے نہ تھے۔ اس میں ''عید'' کا لفظ استعمال کیا گیا تھا اور ۲۵'۲۶رمئی کا ذکر تھا جس سے انگریزوں کی شکست کی طرف اشارہ تھا۔ کرنل نکلسن کو شک ہوا کہ یہ خط مسلمان فوجیوں کی جانب سے باہر کے فوجیوں کی طرف ہے اور سازش کے طور پر ہے جو کہ ۲۶رمئی کے لئے ان کو بلا رہے ہیں۔ اس فقیر پر بھی مقدمہ چلا اور اس کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ [1]

معلوم ہوتا ہے کہ یہ فقیر پٹھان ہوگا' کیونکہ نسوار کے تعلق سے یہی قرین قیاس ہے۔ یہاں پر یہ بات باعث دلچسپی ہوگی کہ ۵۵ دیسی رجمنٹ مردان کی بغاوت کی اطلاع فتح خان خٹک نے انگریزوں کو دی جس کی وجہ سے اکثر سپاہیوں سے اسلحہ لیا گیا' لیکن کچھ مع اسلحہ کے بھاگ کر قریبی پہاڑوں میں پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ فتح خان کو دوسو غیر مسلح شدہ سپاہی قیدیوں کا خیرآباد میں پہنچ کر نگران بنایا گیا۔ اور لارڈ ڈلہوزی نے اس کو خان بہادر کا خطاب دیا اور موضع جہانگیرہ تحصیل صوابی کی جاگیر ملی۔

(1) *Mutiny Reports P:141*

مدیر ''اشراق'' کی خدمت میں

محمد اسحٰق' حیدر آباد

محترمی ومکرمی جناب مدیر ماہنامہ میثاق
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
''المورد'' کے جناب جاوید احمد غامدی صاحب دینی موضوعات پر اپنی تحقیقات نہایت خوبصورت انداز سے لکھتے اور شائع کرتے رہتے ہیں۔ ان کی متعدد تحقیقات سے کئی صاحب علم اختلاف رکھتے ہیں' لیکن ان کی تحقیقات جتنی توجہ کی متقاضی ہیں' اہل علم نے اب تک اتنی توجہ نہیں دی۔ بہرحال اسی سلسلہ میں ایک تحریر منسلک ہے۔ میں نے اس پر نظر ڈال لی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ تحریر زورِ استدلال کے باوجود متانت کی حامل ہے۔
امید ہے کہ اپنے مجلّہ میں اسے جگہ دے کر اس کوشش کی حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔

والسلام
سید وصی مظہر ندوی

اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری دین ہے' جس پر قیامت تک انسانوں کی نجات وہدایت منحصر ہے' اور جسے انسانوں کی بھلائی و رہنمائی کے لئے تاقیامت باقی رہنا ہے۔ دین کے ترجمانوں' خدمت گاروں اور شارحین کا فرض ہے کہ وہ اپنے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات میں دین کی تشریح اس طرح کریں کہ اس کے ابدی حقائق پر نئی نسل کے ذہن اور دماغوں میں اطمینان و یقین پیدا ہو جائے۔

اس سلسلہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے کہ:

كَلِّمُوا النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ يُكَذِّبُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ؟

''لوگوں سے ان کی ذہنی سطح اور عقلی استعداد کے مطابق گفتگو کرو' کیا تم چاہتے

ہو کہ (تمہاری اس گفتگو سے جو اُن کے ذہن وعقل سے بالاتر ہو) وہ اللہ اور اس کے رسولؐ (کی باتوں) کو جھٹلانے لگیں؟''

الحمد للہ یہ فرض ہر زمانے کے مفکرین اسلام اپنے اپنے وقت میں انجام دیتے رہے۔لیکن یہ کام جتنا ضروری ہے اتنا ہی نازک بھی۔اس کام میں اس درجہ احتیاط کی ضرورت ہے کہ ہمارا فکر و مزاج اس دین سے مختلف نہ ہونے پائے کہ جس کی تعلیم حضور ﷺ نے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) کو دی تھی۔ چنانچہ ہر دَور میں ایسے مفکرین پیدا ہوئے جنہوں نے اس نازک کام کو بحسن وخوبی انجام دیا۔تاہم یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ہر دَور میں ایسے اہل علم بھی پیدا ہوئے کہ جنہوں نے دین کی حقیقت کو اپنی منفرد آراء کے ذریعے بدل دینے کی کوشش کی' مگر ان علمی انحرافات وتفردات پر مدلل تنقید و احتساب کر کے اُمت کو ہر گمراہی سے بچانے کا اہتمام بھی اللہ کے فضل سے ہوتا رہا اور اُمت اپنے اس طویل علمی سفر میں مہلک ٹھوکروں اور اجتماعی تحریف سے محفوظ رہی۔

کسی قابل احترام شخصیت کی غلطی یا سہو پر سکوت کے لئے یہ ہرگز کوئی جواز نہیں کہ وہ شخصیت منصب قیادت پر فائز ہے' یا اس کی ذات سے ملت کو اجتماعی طور پر کوئی فائدہ ہو رہا ہے یا اس کا کوئی وسیع حلقہ ہے' اس لئے اس پر تنقید سے انتشار کا اندیشہ ہے یا اس کا حلقہ ناراض ہو جائے گا۔کسی شخص کی دینی خدمات کا لحاظ کیا جائے گا نہ مجاہدانہ کارنامے یا ذاتی فضائل کا۔

اسی اصول کو سامنے رکھ کر میں نے محترم علامہ جاوید احمد صاحب غامدی کی کتاب ''قانونِ دعوت'' پر تنقید کے لئے قلم اٹھانے کی جرأت کی ہے۔

ان کی کتاب ''قانونِ دعوت'' کا میرے سامنے جو ایڈیشن ہے وہ مارچ ۱۹۹۶ء میں شرکت پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپ کر شائع ہوا تھا۔افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کتاب میں انہوں نے کئی مقامات پر دین کی تشریح ومفہوم کو یکسر بدل ڈالنے کی کوشش کی ہے اور بعض مواقع پر انہوں نے دو مختلف مفاہیم کی حامل آیات کو گڈ مڈ کر کے خلط مبحث پیدا کیا ہے۔مثلاً وہ ''دعوت کی مختلف صورتیں'' بیان کرتے ہوئے ''پہلی

صورت'' کے عنوان کے تحت تحریر فرماتے ہیں:

''ایک دوسرے کو حق اور حق پر ثابت قدمی کی یہی نصیحت ہے جسے قرآن مجید نے بعض دوسرے مقامات پر ''امر بالمعروف'' اور ''نہی عن المنکر'' سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی وہ باتیں جو عقل و فطرت اور دین و شریعت کی رو سے معروف قرار دی گئی ہیں ان کی تلقین کی جائے اور وہ باتیں جو اُن کی رو سے منکر قرار پاتی ہیں ان سے روکا جائے۔ یہ درحقیقت منفی اور مثبت دونوں پہلوؤں سے 'تواصی بالحق' کا ہی بیان ہے''۔ (قانونِ دعوت' صفحہ ۱۱)

حالانکہ تواصی بالحق اور نہی عن المنکر دو بالکل الگ الگ اصطلاحات ہیں' جو قرآن مجید میں بالکل الگ الگ مفہوم کے لئے وارد ہوئی ہیں۔ علامہ جاوید غامدی صاحب کی یہ بات تو بالکل درست ہے کہ ''تواصی بالحق'' حق بات کی تلقین کرنے کے مفہوم میں ہی استعمال ہوا ہے' لیکن بڑا فرق ہے اس بات میں کہ ہم کسی کو حق بات کی نصیحت اور حق پر قائم رہنے کی تلقین کریں اور اس بات میں کہ ہم دین میں جن باتوں سے روکا گیا ہے' اُس سے بااختیار طور پر روک دیں اور جن باتوں کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کو بزور جاری و نافذ کر دیں۔ چنانچہ اُمت کے اکابر ہمیشہ ان دونوں اصطلاحوں کو الگ الگ مفہوم میں استعمال کرتے آئے ہیں۔

جاوید احمد غامدی صاحب اس دَور میں مکتب فراہیؒ کے نمائندہ فرد کی حیثیت رکھتے ہیں اور یہی اُن کی اصل پہچان بھی ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انہیں سب سے پہلے استاذ امام علامہ حمید الدین فراہیؒ کی یہ عبارت ہی یاد دلا دی جائے کیونکہ استاذ امام حمید الدین فراہیؒ نے سورۂ آلِ عمران کی آیت:

﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ﴾ (آل عمران : ۱۱۰)

نقل کر کے جو تشریح فرمائی ہے اُس سے بھی یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''اس آیت سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس اُمت کے اہم

فرائض میں سے ہے' چنانچہ اس کے متعلق دوسری آیات بھی وارد ہیں۔ لیکن یہ امر واضح ہے کہ اس کی اصل ذمہ داری' جیسا کہ ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ﴾ سے متبادر ہے' اُمت کے اصل لیڈروں پر ہے' البتہ تواصی ایک عام فرض ہے جس میں تمام مسلمان برابر کے شریک ہیں۔'' (مجموعہ تفاسیر فراہیؒ' صفحہ ۳۴۳)

آگے چل کر ''پہلی صورت'' ہی کے عنوان کے تحت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے انہوں نے اختیار کی حدود متعین کرتے ہوئے ایک حدیث نقل کی ہے اور پھر اُس پر اپنی جانب سے درج ذیل ترجمہ وتشریح فرمائی ہے:

((اَلَا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ)) (مسلم' کتاب الامارة)

''آگاہ رہو کہ تم میں سے ہر شخص چرواہا بنادیا گیا ہے اور ہر ایک سے اس کے گلہ کے بارے میں پوچھا جائے گا۔''

چنانچہ ''تواصی بالحق'' کی اسی ذمہ داری کے تحت ہر شخص پر یہ بات لازم کی گئی ہے کہ وہ اگر کوئی منکر دیکھے تو اپنے اس دائرۂ اختیار میں اس کے ازالہ کی کوشش کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے اہلِ ایمان کی یہ ذمہ داری اس طرح واضح کی ہے:

((مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ' فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ' فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ' وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ)) (مسلم' کتاب الایمان)

''تم میں سے جو شخص (اپنے دائرہ اختیار میں) کوئی برائی دیکھے اسے چاہئے کہ وہ ہاتھ سے اس کا ازالہ کرے' پھر اگر اس کی ہمت نہ ہو تو زبان سے' اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو دل سے اُسے ناگوار سمجھے اور یہ ایمان کا ادنیٰ ترین درجہ ہے۔''

(قانونِ دعوت' صفحہ ۱۴)

حدیثِ شریف کا جو ترجمہ علامہ صاحب نے کیا ہے وہ بھی محلِ نظر ہے' کیونکہ حدیث میں فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ کے الفاظ کا صحیح ترجمہ ہوگا ''تو وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے''۔ ہاتھ کنایہ ہے طاقت سے اور حدیث صرف اس کے ازالہ کا مطالبہ نہیں کرتی بلکہ منکر کو مٹا کر اس کی جگہ معروف کو قائم کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اسی طرح ''فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ'' کا ترجمہ ''اگر ہمت نہ ہو'' بالکل غلط ہے۔ صحیح ترجمہ ''اگر استطاعت (قوّت) نہ ہو'' ہے۔ اسی طرح یہ ترجمہ ''دل سے اُسے ناگوار سمجھے'' بھی درست نہیں' کیونکہ

فَبِقَلْبِهٖ کا عطف فَلْيُغَيِّرْهُ پر ہے یعنی ''وہ اُسے اپنے دل سے بدلے (بدلنے کا عزم کرے)'' صحیح ترجمہ ہوگا۔

حدیث کے آخری ٹکڑے سے یہ مفہوم مترشح ہوتا ہے کہ انسان جب منکرات کو دیکھ کر نہ ہاتھ سے بدلنے کی پوزیشن میں ہو اور نہ زبان سے برملا اس پر تنقید کر سکتا ہو تو اسے دل میں ان منکرات کے بدلنے کا عزم ضرور رکھنا چاہئے' ورنہ صرف دل سے برا سمجھ کر خاموش بیٹھ رہنے سے تو منکرات میں کمی آنے کے بجائے زیادتی ہی ہوتی چلی جائے گی۔ اسی طرح حدیث'' اَلا كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ '' سے بھی صاف واضح ہو رہا ہے کہ جس طرح چرواہا اپنے ہاتھ میں موجود ڈنڈے کو حرکت میں لاکر اپنی بھیڑوں کو غلط پگڈنڈیوں پر جانے سے بزور روکتا ہے' بالکل اسی طرح سے منکرات کے خلاف بھی صاحب اختیار لوگ ''امر بالمعروف اور نہی عن المنکر'' کے لئے قوّت کا استعمال کریں۔ اس حدیث سے یہ ظاہر ہے کہ ''نہی عن المنکر'' کے لئے قوّت کا استعمال کیا جائے گا۔

((مَنْ رَاٰى مِنْكُمْ مُنْكَرًا ...... وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ)) والی حدیث نے بھی ''تواصی بالحق'' اور ''نہی عن المنکر'' کی اصطلاحوں میں واضح خطِ تفریق کھینچ دیا ہے۔

محترم جاوید احمد صاحب غامدی ''دعوت کی مختلف صورتیں'' میں ''دوسری صورت'' کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''دعوت کی دوسری صورت وہ ہے جس کا حکم سورۂ آلِ عمران کی آیت: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ میں آیا ہے۔ اس حکم کا تعلق اربابِ اقتدار سے ہے۔ اہلِ ایمان کے لئے ان کے پروردگار نے یہ بات لازم ٹھہرائی ہے کہ انہیں اگر کسی سرزمین میں سیاسی خودمختاری حاصل ہو جائے تو وہ اپنے اندر سے ایک گروہ کو اس کام پر مقرر کریں کہ وہ لوگوں کو خیر کی طرف بلائے' برائی سے روکے اور بھلائی کا حکم دے''۔ (قانونِ دعوت' صفحہ ۱۵)

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ حکومت خود بخود زمین سے اُگ آئے گی یا اُسے وجود میں لانے کی کوشش بھی کرنا ہوگی؟

حضرت مولانا امین احسن اصلاحیؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''یہ اُمت کو اس اہتمام و انتظام کی ہدایت فرمائی گئی ہے جو اعتصام بحبل اللہ پر قائم رہنے اور لوگوں کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے یہ ہدایت ہوئی کہ مسلمان اپنے اندر سے ایک گروہ کو اس کام پر مقرر کریں' وہ لوگوں کو نیکی اور بھلائی کی دعوت دے' معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے۔ معروف و منکر سے مراد شریعت اور سوسائٹی دونوں کے معروفات و منکرات ہیں' اور ان کے لئے امر و نہی کے جو الفاظ استعمال ہوئے ان کا غالب قرینہ یہی ہے کہ یہ کام مجرد وعظ و تلقین ہی سے نہیں انجام دینا ہے' اختیار و قوت سے اس کو نافذ کرنا ہے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ یہ گروہ اُمت کی طرف سے سیاسی اقتدار کا حامل ہو۔ اگر تنہا دعوت و تبلیغ ہی سے یہ کام لینا مدنظر ہوتا تو اس مطلب کو ادا کرنے کے لئے ''یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ'' کے الفاظ کافی تھے ''یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ'' (الآیۃ) کی ضرورت نہیں تھی۔

ہمارے نزدیک اس آیت سے اس اُمت کے اندر خلافت کے قیام کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے' چنانچہ اسی حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے نبی ﷺ کی وفات کے بعد پہلا کام جو کیا وہ خلافت علیٰ منہاج النبوت کا قیام تھا۔''

(تدبر قرآن' جلد دوم' صفحہ ۱۵۴' ۱۵۵)

اسی سے قریب تر مفہوم استاذ امام علامہ حمید الدین فراہیؒ نے وَلْتَکُنْ مِّنْکُمْ اُمَّۃٌ کا حوالہ دیتے ہوئے سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۱۰ کے تحت بیان کیا ہے۔ وہ رقم فرماتے ہیں:

''اس سے معاملہ کی اصل حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ وہ عمل صالح کریں' پھر ادائے حقوق کے معاملہ میں ایک دوسرے کی مدد کریں' اور چونکہ ادائے حقوق بغیر خلافت و سیاست کے ناممکن ہے اس لئے ضروری ہے کہ خلافت قائم کریں۔''

(مجموعہ تفاسیرِ فراہیؒ' صفحہ ۳۴۴)

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ نہ تو یہ اہل اقتدار زمین سے اگیں گے اور نہ ہی آسمان سے برس پڑیں گے' بلکہ دعوت کے ساتھ ساتھ سیاسی خودمختاری کی کوشش بھی کرنا پڑے گی۔ آیت کا اندازِ خطاب بتا رہا ہے کہ یہ چیز واجب کا درجہ رکھتی ہے۔

ان اکابر کی آراء سے معلوم ہوا کہ اس اُمت کا مقصد ہی یہ ہے کہ اللہ کے دین کو قائم کرنے اور اس کے قائم کرنے کا واحد ذریعہ اسلامی نظامِ حکومت کا قائم کرنا ہے۔

جناب جاوید احمد غامدی صاحب نے اپنی اس کتاب میں جگہ جگہ یہ تو فرمایا کہ "اگر یہ سیاسی اقتدار حاصل ہو جائے" مثلاً صفحہ ۱۵' ۱۹' ۲۵ وغیرہ' لیکن یہ جواب کہیں دیتے نظر نہیں آتے کہ یہ نظام قائم کیسے ہوگا؟ اس کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں گی؟

اسی طرح انہوں نے خروج کی تین شرائط بیان کی ہیں۔ مگر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسلمانوں کی اکثریت اس حد تک گمراہ ہو چکی ہو کہ وہ کفر بواح کے مرتکب افراد کو اپنی حکومت سونپنے کے لئے منتخب کر لے تو پھر خروج کی شرائط کیا ہوں گی؟

محترم جاوید احمد غامدی صاحب کی کتاب "میزان" نظر ثانی شدہ ایڈیشن میں مضمون "قانونِ دعوت" پر بھی اب انہوں نے نظر ثانی کر کے کچھ مزید تفردات کا اضافہ کر دیا ہے۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں:

> "نبیوں کا انذار و بشارت تو کسی وضاحت کا تقاضا نہیں کرتا' لیکن رسولوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ انذار و بشارت کے ساتھ وہ شہادت کی جس ذمہ داری کے لئے مامور ہوتے ہیں' اس کے تقاضے سے ان کی دعوت کے چند مراحل اور ان مراحل کے چند نتائج ہیں جو انہی کے ساتھ خاص ہیں"۔
>
> (میزان' صفحہ ۱۸۴' ۱۸۵)

لیکن پھر اپنی ہی بات کی تردید کرتے ہوئے انہوں نے' جو حق نبیوں کو بھی حاصل نہ تھا وہ صحابہؓ کی جماعت کے لئے ثابت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "چنانچہ جس طرح رسولوں کو اپنی قوم پر حجت کے بعد یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اسے عذاب کے حوالے کر دیں' اسی طرح صحابہؓ کو بھی' جب وہ رسولوں کی شہادت کے پسِ منظر میں اور "خیر اُمت" بن کر اٹھے تو بحیثیت جماعت یہ حق حاصل ہوا کہ وہ روم و ایران کی سرحدوں پر کھڑے ہو کر انہیں اسلام کی دعوت دیں اور قبول نہ کرنے کی صورت میں جہاد و قتال کے ذریعہ سے زیرِ دست بنا کر اُن پر جزیہ عائد کر دیں۔ یہ صحابہ کا منصب تھا۔ نبوت جس طرح نبی ﷺ پر ختم ہو گئی اسی طرح شہادت کا یہ منصب اور اس کے ساتھ منکرینِ حق

سے قتال اور اُن پر جزیہ عائد کرنے کا حق بھی ان نفوسِ قدسیہ پر ختم ہوا''۔
(میزان' صفحہ۲۰۳)

محترم جاوید غامدی صاحب نے یہاں پھر خلط مبحث پیدا کرتے ہوئے رسولوں کے ساتھ ساتھ صحابہؓ کی جماعت کو بھی حجت بنا کر پیش کر دیا ہے۔ اُن کی اِس تحقیق پر عقل روتی اور علم ہنستا ہے۔ یہ دُور کی ایسی کوڑی لانا ہے کہ جس کی تائید میں وہ علمائے اُمت کی تائید سے محروم ہیں۔ وہ اس بات کی دلیل کے لئے جن آیات کا سہارا لے رہے ہیں انہیں سیاق و سباق سے کاٹ کر انہوں نے من مانا مفہوم دیا ہے' کیونکہ رسولوں کے لئے حجت ہونا تو قرآن مجید سے ثابت ہے لیکن انہوں نے جس طرح آیات کے معنی تبدیل کر کے صحابہؓ کے لئے اسے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اس پر سوائے اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ۔

احکام ترے حق ہیں' مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند!

جاوید صاحب نے رسولوں کی طرف سے اتمامِ حجت قائم کرنے اور پھر اس کے نتیجہ میں منکرینِ حق کی ہلاکت کو اللہ تعالیٰ کی ثابت شدہ سنّت مانا ہے اور رسولوں کے اس مقام پر فائز ہونے کے اسباب و دلائل کو جناب جاوید احمد غامدی صاحب نے بہت اچھی طرح بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''یہ چیز ظاہر ہے کہ بحیثیتِ فرد اگر کسی شخص کی سعیِ دعوت سے حاصل ہو سکتی ہے تو وہ تنہا رسول ہی کی ہستی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ صرف رسول ہی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے ان تمام اسباب و دلائل سے پوری طرح تیار کر کے بھیجتا ہے جو عقل پر اتمامِ حجت کے لئے ضروری ہے۔ وہ اپنی قوم میں نخلِ فطرت کا بہترین ثمر ہوتا ہے۔ اس کو دیکھنے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعمیر شخصیت میں حسن فطرت کی ہر چیز ''فی الواقع'' کام آ گئی ہے۔ وہ اپنی زندگی کے ہر دَور میں اخلاقِ عالیہ کا بہترین نمونہ ہوتا ہے۔ اس کے ان محاسن کا اعتراف اس کے دوست بھی کرتے ہیں اور دشمنوں کو بھی ان سے انکار کی مجال نہیں ہوتی۔ وہ

اپنے پروردگار کی طرف سے ایسی واضح ہدایت لے کر آتا اور اس طرح لے کر آتا ہے کہ اس میں فہم کی کسی کوتاہی اور ابلیس کی کسی دراندازی کا کسی درجے میں کوئی امکان نہیں ہوتا۔ یہ ہدایت اس کو وحی کے ذریعے سے ملتی' عالم کا پروردگار خود اُس کا سینہ اس کے لئے کھولتا' اپنے فرشتے اس کی تعلیم کے لئے بھیجتا' اس کو اپنا کلام خود پڑھاتا' اس کے سینے میں خود اسے محفوظ کرتا' اس کی تبلیغ کے دوران میں ہمہ وقت اس کی نگرانی رکھتا اور اس کام میں خود اُس کی اُدنیٰ لغزش کی بھی خود اصلاح فرما دیتا ہے۔ اس کی زبان سے جو کچھ نکلتا ہے وہ لفظ و معنی کے اعتبار سے تفہیم و بلاغت کی آخری انتہا پر ہوتا ہے۔ وہ اپنی بات کو اپنے عمل سے اس طرح مطابق کر دیتا ہے کہ دونوں میں کسی ادنیٰ فرق کی نشان دہی بھی کسی شخص کے لئے ممکن نہیں ہوتی۔ وہ اپنے سے پہلے پیغمبروں کی پیشین گوئیوں کا مصداق بن کر آتا ہے اور لوگوں کے مطالبے پر' اگر ضرورت ہو تو' انہیں معجزے بھی دکھاتا ہے۔ ان وجوہ سے یہ صرف رسول ہی کے لئے ممکن ہے کہ وہ اپنی دعوت کو قوم کے لئے حق کی شہادت بنا دے۔ چنانچہ اس کی طرف سے یہی اتمامِ حجت ہے جس کی بنا پر اس کے منکرین پھر لازماً عذابِ الٰہی کی زد میں آ جاتے اور اسے بھی یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ ان پر موت کی سزا نافذ کر دے''۔ (قانونِ دعوت' صفحہ ۱۷' ۱۸)

غور کیجئے' ان میں سے کون سی بات ایسی ہے جس پر کوئی فرد یا اُمت پوری اتر سکے؟ اسی لئے ''اتمامِ حجت'' صرف رسول ہی کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی ﷺ نے اتمامِ حجت کے بعد بنی اسماعیل کے ایمان نہ لانے پر سزائے موت نافذ کر دی۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ﴾ (التوبة : ٥)

''پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں ان کی خبر لینے کے لئے بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور

نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو۔''

اس آیت کی تفسیر کے تحت حضرت مولانا امین احسن اصلاحیؒ رقم فرماتے ہیں:

''اس شدت کے ساتھ ان کی دارو گیر کے اس حکم کی وجہ یہ ہے کہ اس کی نوعیت محض ایک دشمن کے خلاف اقدام کی نہیں ہے بلکہ یہ مشرکین عرب کے لئے اس سنت الٰہی کا ظہور تھا جو رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کے لئے ہمیشہ ظاہر ہوئی ہے۔'' (تدبر قرآن' جلد سوم' صفحہ ۵۴۰)

شہادت علی الناس کا معاملہ اتمامِ حجت سے مختلف ہے۔ رسول کی شہادت اُمت پر اور اُمت کی شہادت رہتی دنیا تک تمام عالم پر' دونوں کے مدارج مختلف ہیں۔ رسول کی شہادت تو کامل و اکمل ہے جبکہ پوری اُمت شہادت علی الناس کی ذمہ دار تو ہے مگر یہ شہادت ہرگز رسول کے درجۂ شہادت تک نہیں پہنچ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اب کسی فرد یا گروہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ منکرین پر سزائے موت نافذ کر دے۔ لہٰذا جناب جاوید صاحب کا یہ دعویٰ کہ:

''یہ دعوت ''شہادت علی الناس'' ہے' قرآن کی اصطلاح میں یہ وہی دعوت ہے جس سے دین کی حجت پوری دنیا پر قائم ہوگئی''۔ (میزان' صفحہ ۲۰۱)

بلا دلیل ہے۔ قرآن میں یہ اصطلاح کہاں بیان ہوئی ہے؟ قرآن میں تو رسولوں کے انذار و تبشیر کو اتمامِ حجت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ﴾ (النساء : ١٦٥)

اتمامِ حجت کا یہ مقام صحابہؓ کو حاصل ہونے کی نہ کوئی دلیل ہے۔ حقیقتاً اس ذمہ داری کے لئے جن خصوصیات کے حامل رسول ہوتے ہیں وہ خصوصیات صحابہؓ کو حاصل نہ تھیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ حاصل نہ ہو سکتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے دعوت اور غلبۂ اسلام کے لئے جہاد و قتال تو کیا لیکن کسی کافر پر محض کفر کی وجہ سے سزائے موت نافذ نہیں کی' جیسا کہ رسول اتمامِ حجت کے بعد کرتے ہیں۔ جاوید صاحب کا یہ فرمانا:

''چنانچہ جس طرح رسولوں کو اپنی قوم پر اتمامِ حجت کے بعد یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ اسے عذاب کے حوالے کر دیں، اسی طرح صحابہؓ کو بھی، جب وہ رسول کی شہادت کے پس منظر میں اور ''خیر اُمت'' بن کر اٹھے تو بحیثیتِ جماعت یہ حق حاصل ہوا کہ وہ روم و ایران کی سرحدوں پر کھڑے ہو کر انہیں اسلام کی دعوت دیں اور اسے قبول نہ کرنے کی صورت میں جہاد و قتال کے ذریعہ سے زیر دست بنا کر ان پر جزیہ عائد کر دیں''۔ (میزان، صفحہ ۲۰۳)

یہ دعویٰ بھی ان کا ایسا ہے کہ ؏

ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے!

کیونکہ جو اتمامِ حجت حضور ﷺ نے اپنی قوم میں چالیس برس کی پاکیزہ زندگی گزارنے اور کم و بیش مزید ۲۳ سال تک براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ہدایت و نگرانی میں مکمل کیا وہ ''اتمامِ حجت'' صحابہ کرامؓ نے صرف روم و ایران کی سرحدوں پر کھڑے ہو کر محض اسلام کی دعوت دے کر انجام دے دیا۔ اگر فی الواقع جاوید صاحب کے دعویٰ کے مطابق یہ ''اتمامِ حجت'' ہے تو قرآنی فیصلے کے مطابق منکرین کو آسمانی عذاب سے یا صحابہؓ کے ہاتھوں تہِ تیغ کر دیا جانا چاہیئے تھا۔ آخر حجت قائم ہو جانے کے بعد اُن کو جزیہ لے کر چھوڑ دینے کی کہاں گنجائش تھی؟

دراصل صحابہ کرامؓ اور پوری اُمت پر صرف شہادت علی الناس کی ذمہ داری ہی ہے، اتمامِ حجت کی نہیں۔ شہادت کا حق اگر اُمت نے ادا کیا تو وہ بریٔ الذمہ ہے اور اگر کوتاہی کی تو کوتاہی کی حد تک جواب دہ ہے۔ اللہ کی رحمت سے توقع کی جا سکتی ہے کہ شہادتِ حق میں کوتاہی کی صورت میں منکرین کو بھی اس حد تک رعایت مل جائے جتنی کہ کوتاہی ہوئی ہے۔

شہادت علی الناس کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ وہ محض صحابہ کا منصب تھا اور پوری اُمت اس کی مکلف نہیں ہے، سراسر غلط دعویٰ ہے۔ کیونکہ صحابہؓ کے دور کے بعد جو لوگ پیدا ہوئے ان کے سامنے شہادت کون دے گا اور شہادت کے بغیر اُن کا محاسبہ کیسے ہوگا؟

غامدی صاحب نے صحابہؓ کے اس منصب پر فائز ہونے کے لئے دلیل کے طور پر یہ آیت نقل کی ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾

حالانکہ کسی ناقابلِ انکار قرینہ کے بغیر قرآنِ حکیم کے اس طرح کے خطاب کے صرف دورِ نبوت کے لوگوں تک محدود کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ قرآن مجید کا بیشتر حصہ متروک العمل یا قصۂ ماضی بن جائے گا۔

حضرت مولانا امین احسن صاحب اصلاحیؒ اس آیت کی تفسیر کے تحت رقم طراز ہیں:

''رسول تم پر گواہ اور تم لوگوں پر گواہ ہو'' سے یہ بات واضح طور پر نکلتی ہے کہ شہادت علی الناس کا جو فرض آنحضرت ﷺ پر بحیثیت رسول کے تھا آپؐ کے بعد آپؐ کی اُمت کی طرف منتقل ہوا اور اب یہ اُمت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر دور، ہر ملک اور ہر زبان میں لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دے، اگر وہ اس فرض میں کوتاہی کرے گی تو اس دنیا کی گمراہی کے نتائج بھگتنے میں دوسروں کے ساتھ وہ بھی برابر کی شریک ہوگی۔'' (تدبر قرآن، جلد اول، صفحہ ۳۶۴، ۳۶۵)

علاوہ ازیں خود جناب غامدی صاحب نے اسی آیت کریمہ کی تشریح و تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''رسول کے بعد اس کا کوئی پیرو لوگوں پر تنہا یہ شہادت قائم نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید نے اس بدیہی حقیقت ہی کے پیشِ نظر دعوت کی اس صورت کے لئے پیغمبر کی نیابت اس اُمت کو بحیثیت اُمت منتقل کی ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ......﴾ ''۔ (قانون دعوت، صفحہ ۱۸)

اسی سلسلہ میں وہ آگے چل کر تحریر فرماتے ہیں:

''یہ صرف اُمت ہی کے لئے ممکن ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد اس دنیا کی تمام دوسری قوموں کے لئے اس کا وجود اس سرزمین پر دین کی شہادت بن جائے۔'' (قانونِ دعوت، صفحہ ۱۹)

ایک اہم بات کی جانب اشارہ کر کے اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ اُمت کے ''خیر اُمت'' ہونے کے لئے یہ بات شرط نہیں کہ اس کے جن افراد نے براہِ راست رسول

اللہ ﷺ سے تربیت پائی ہو صرف وہی ''خیر اُمت'' کہلائیں' بلکہ اُمت کے ''خیر اُمت'' ہونے کی اصل وجہ یہ ہے کہ:

''﴿تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ یہ اُمت کے ''خیر اُمت'' ہونے کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس لئے خیر اُمت ہو کہ تم معروف کا حکم دیتے ہو' منکر سے روکتے ہو' اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس منصب پر تم نسل و نسب کی بنا پر نہیں سرفراز ہوئے ہو' جیسا کہ اہلِ کتاب نے اپنی بابت گمان کیا' بلکہ ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر'' کی ذمہ داری نے تمہیں اس کا استحقاق بخشا ہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہوگئی کہ یہ منصب صفات اور ذمہ داریوں کے ساتھ مشروط ہے کسی مخصوص گروہ کے ساتھ اللہ نے اس کو باندھ نہیں چھوڑا ہے کہ لازماً یہ اس کے ساتھ بندھا ہی رہے۔'' (تدبر قرآن' جلد دوم' صفحہ ۱۶۰)

خوش خبری : فہمِ قرآن میں اضافے کے لیے نئی کتاب

'قواعد زبان قرآن' کا دوسرا حصہ شائع ہوگیا ہے

صفحات 948 ، رعایتی قیمت 300 + ڈاک خرچ 50 = کل قیمت 350 روپے

حصہ اول اور حصہ دوم دونوں کی کل رعایتی قیمت مع ڈاک خرچ = 650 روپے

نئے ایڈیشن اور نئی کتابوں کی رعایتی قیمتیں

1	قواعدِ زبانِ قرآن حصہ اول (تیسرا ایڈیشن)	خلیل الرحمٰن چشتی	250 روپے
2	قواعدِ زبانِ قرآن (حصہ دوم)	خلیل الرحمٰن چشتی	300 روپے
3	اسلامی تربیت گاہیں	محمد خان منہاس، چشتی	40 روپے
4	تزکیہ نفس ، مفہوم ، ماہیت اور عملی تدبیریں	محمد خان منہاس، چشتی	50 روپے

تیرہ (13) کتابوں کے مکمل سیٹ کی قیمت مع ڈاک خرچ -/905 روپے ہے

کتابیں وی۔ پی نہیں کی جائیں گی۔ منی آرڈر یا ڈرافٹ پہلے آنا لازمی ہے۔

الفوز اکیڈمی ، اسلام آباد	317, Street 16, F-10/2, Islamabad
Fax : 051 - 22 54 139	Tel: 051- 22 51 933

<u>**گوشہ خواتین**</u>

کیا پردہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے؟

محترمہ پروین رضوی

مورخہ ۲؍مارچ ۱۹۵۵ء نشتر میڈیکل کالج ملتان میں آل پاکستان انٹرکالجیٹ مباحثہ منعقد ہوا۔ بحث کا عنوان تھا ''اس ایوان کی رائے میں پردہ ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے''۔
اس بحث میں جس لڑکی کو فرسٹ پرائز ملا وہ پروین رضوی ملتان کالج فار ویمن کی تھرڈ ایئر کی طالبہ تھی' یہ بات قابل ذکر ہے کہ مقررہ نے پس پردہ تقریر کرنے کی اجازت چاہی مگر اسے یہ اجازت نہ مل سکی۔ چنانچہ اس نے چادر اوڑھ کر تقریر کی۔ ذیل میں وہ تقریر درج کی جاتی ہے جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ مقررہ نے کس قدر معقول دلائل کے ساتھ اپنے موضوع کو پیش کیا۔ مباحثہ کے اختتام پر جب ایوان سے رائے لی گئی تو عظیم الشان اکثریت کے ساتھ ایوان نے پردہ کے حق میں رائے دی اور دوسری طرف ایک فی صدی سے زائد ووٹ نہ تھے۔

پردہ ملک کی ترقی میں رکاوٹ ہے یا نہیں؟ اس سوال کا فیصلہ کرنے کے لئے ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہئے کہ پردہ ہے کیا چیز' کیونکہ اس کے بغیر ہم اس کی غرض' اس کے فائدہ اور اس کے نقصان کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس کے بعد ہمیں یہ طے کرنا چاہئے کہ وہ ترقی کیا ہے جسے ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اسے طے کئے بغیر ہم یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ پردہ اس میں حائل ہے یا نہیں۔

پردہ عربی زبان کے لفظ حجاب کا لفظی ترجمہ ہے۔ جس چیز کو عربی میں حجاب کہتے ہیں اسی کو فارسی اور اردو میں پردہ کہتے ہیں۔ حجاب کا لفظ قرآن مجید کی اس آیت میں آیا ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو نبی ﷺ کے گھر میں بے تکلف آنے جانے سے منع فرمایا تھا اور حکم دیا تھا کہ اگر گھر کی خواتین سے کوئی چیز مانگنی ہو تو حجاب (پردے) کی اوٹ سے مانگا کرو۔[1] اسی حکم سے پردے کے احکام کی ابتدا ہوئی' اور پھر جتنے

(۱) سورۃ الاحزاب آیت ۵۳

احکام اس سلسلے میں آئے ان سب کے مجموعے کو احکامِ حجاب (یعنی پردے کے احکام) کہا جانے لگا۔ پردے کے یہ احکام سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ ان میں عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ رہیں، اپنے حسن اور آرائش کی نمائش نہ کرتی پھریں جس طرح زمانۂ جاہلیت کی عورتیں کرتی تھیں، گھروں سے باہر نکلنا ہو تو اپنے اوپر ایک چادر ڈال کر نکلیں اور بجنے والے زیور پہن کر نہ نکلیں، گھروں کے اندر بھی محرم مَردوں اور غیر محرم مَردوں کے درمیان امتیاز کریں، محرم مَردوں اور گھر کے ملازموں اور میل جول کی عورتوں کے سوا کسی کے سامنے زینت کے ساتھ نہ آئیں (زینت کے وہی معنی ہیں جو ہماری زبان میں آرائش وزیبائش اور بناؤ سنگھار کے ہیں، اس میں خوشنما لباس، زیور اور میک اپ تینوں چیزیں شامل ہیں)۔

پھر محرم مَردوں کے سامنے بھی عورتوں کو حکم دیا گیا کہ اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈال کر رکھیں اور اپنا ستر چھپائیں۔ گھر کے مَردوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ ماں بہنوں کے پاس بھی آئیں تو اجازت لے کر آئیں تاکہ اچانک ان کی نگاہ ایسی حالت میں نہ پڑے جب کہ وہ جسم کا کوئی حصّہ کھولے ہوئے ہوں۔ یہ احکام ہیں جو خود قرآن حکیم میں دیئے گئے ہیں اور انہی کا نام ''پردہ'' ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کی تشریح فرماتے ہوئے فرمایا کہ عورت کا ستر، چہرے کلائی کے جوڑ تک ہاتھ اور ٹخنے تک پاؤں کے سوا اس کا پورا جسم ہے، جسے باپ بھائی تک سے چھپا کر رکھنا چاہیے اور ایسے باریک اور چست کپڑے نہ پہننے چاہئیں جس سے جسم نمایاں ہو۔ نیز اپنے محرم مَردوں کے سوا کسی اور مَرد کے ساتھ تنہا رہنے سے عورتوں کو منع فرمایا اور محرم مَردوں کے بغیر تنہا یا کسی غیر آدمی کے ساتھ سفر کرنے سے روک دیا۔ آپ نے عورتوں کو اس بات سے بھی منع فرمایا کہ وہ گھر کے باہر خوشبو لگا کر نکلیں۔ مسجد کے اندر نماز باجماعت میں آپ نے عورتوں کے لئے الگ جگہ مقرر فرمائی تھی اور اس بات کی اجازت نہ دی تھی کہ عورت مَرد مل جل کر ایک صف میں نماز پڑھیں۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ ﷺ

اور سب مَرد اس وقت تک بیٹھے رہتے تھے جب تک عورتیں نہ چلی جاتیں۔

یہ احکام جس کا جی چاہے قرآن مجید کی سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب میں اور حدیث کی مستند کتابوں میں دیکھ سکتا ہے۔ آج جس چیز کو ہم پردہ کہتے ہیں اس میں چاہے عملی طور پر افراط و تفریط ہو گئی ہو لیکن اصول اور قاعدے سب وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مدینہ پاک کی مسلم سوسائٹی میں جاری کئے تھے۔ اگرچہ میں خدا اور رسول کا نام لے کر آپ کی زبان بند کرنا نہیں چاہتی مگر یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتی کہ آج ہمارے اندر یہ آواز اٹھنا کہ یہ ''پردہ ہماری ترقی میں رکاوٹ ہے'' ہماری دورخی ذہنیت کی کھلی علامت ہے۔ یہ آواز خدا اور رسول کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ ہے۔ اور اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ خدا اور رسول نے ہماری ترقی کے راستے میں روڑے اٹکا دیئے ہیں۔ اگر واقعی ہم ایسا سمجھتے ہیں تو آخر ہم کیوں خواہ مخواہ مسلمان بنے ہوئے ہیں اور کیوں اُس خدا اور رسول کو ماننے سے انکار نہیں کر دیتے جنہوں نے ہم پر ایسا ظلم کیا ہے۔ اس سوال سے یہ کہہ کر چھٹکارا حاصل نہیں کیا جا سکتا کہ خدا اور رسول نے پردے کا حکم ہی نہیں دیا ہے۔ میں ابھی عرض کر چکی ہوں کہ پردہ کس چیز کا نام ہے' اور اس کے تفصیلی احکام جس کا جی چاہے قرآن مجید اور احادیث کی مستند کتب میں نکال کر دیکھ سکتا ہے۔ حدیث کی صحت سے کسی کو انکار بھی ہو تو قرآن کے کھلے کھلے احکام کو آخر وہ کہاں چھپائے گا۔ پردہ کے یہ احکام جو اسلام نے ہم کو دیئے ہیں ان پر تھوڑا سا بھی غور کیجئے تو سمجھ میں آ سکتا ہے کہ ان کے تین بڑے بڑے مقصد ہیں۔

اوّل: یہ کہ عورتوں اور مَردوں کے اخلاق کی حفاظت کی جائے اور ان خرابیوں کا دروازہ بند کیا جائے جو مخلوط سوسائٹی میں عورتوں اور مَردوں کے آزادانہ میل جول سے پیدا ہوتی ہیں۔

دوسرے: یہ کہ عورتوں اور مَردوں کا دائرۂ عمل الگ کیا جائے تاکہ فطرت نے جو فرائض عورت کے سپرد کئے ہیں انہیں وہ سکون کے ساتھ انجام دے سکے اور جو خدمات مَرد کے سپرد کی ہیں انہیں وہ اطمینان کے ساتھ بجا لا سکے۔

تیسرے: یہ کہ گھر اور خاندان کے نظام کو مضبوط اور محفوظ کیا جائے جس کی اہمیت زندگی کے دوسرے نظاموں سے کم نہیں' بلکہ کچھ بڑھ کر ہی ہے۔ پردہ کے بغیر جن لوگوں نے گھر اور خاندان کے نظام کو محفوظ کیا ہے انہوں نے عورت کو غلام بنا کر تمام حقوق سے محروم کر کے رکھ دیا ہے اور جنہوں نے عورت کو اس کے حقوق دینے کے ساتھ پردہ کی پابندیاں بھی نہیں رکھی ہیں' ان کے ہاں گھر اور خاندان کا نظام بکھر گیا ہے اور روز بروز بکھرتا جا رہا ہے۔ اسلام عورت کو اس کے پورے حقوق بھی دیتا ہے اور اس کے ساتھ گھر اور خاندان کے نظام کو بھی محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ پردہ کے احکام اس کی حفاظت کے لئے موجود نہ ہوں۔

خواتین وحضرات! میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ ٹھنڈے دل سے ان مقاصد پر غور کریں۔ اخلاق کا مسئلہ کسی کی نگاہ میں اہمیت نہ رکھتا ہو تو اس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں' مگر جس کی نگاہ میں اس کی کوئی اہمیت ہو اسے سوچنا چاہیئے کہ مخلوط سوسائٹی میں جہاں بن سنور کر عورتیں آزادانہ پھریں اور زندگی کے ہر شعبہ میں مَردوں کے ساتھ کام کریں وہاں اخلاق بگڑنے سے کیسے بچ سکتے ہیں اور کب تک بچ سکتے ہیں۔ ہمارے اپنے ملک میں یہ صورتِ حال جتنی بڑھتی جا رہی ہے جنسی جرائم بھی بڑھتے جا رہے ہیں اور ان کی خبریں آپ آئے دن اخبارات میں پڑھ رہے ہیں۔ یہ کہنا کہ ان خرابیوں کا اصل سبب پردہ ہے' جب پردہ نہ رہے گا تو لوگوں کا دل عورتوں سے بھر جائے گا' بالکل غلط ہے۔ جہاں پوری بے پردگی تھی وہاں لوگوں کے دل نہ بھرے اور ان کی خواہشات کے تقاضوں نے عریانی تک نوبت پہنچائی' پھر عریانی سے بھی دل نہ بھرے اور کھلی کھلی جنسی آوارگی تک نوبت پہنچی اور اب جنسی آوارگی کے کھلے لائسنس سے بھی دل نہیں بھرا ہے اور آج بھی کثرت سے جنسی جرائم ہو رہے ہیں جن کی رپورٹیں امریکہ' انگلستان اور دوسرے ملکوں کے اخبارات میں آتی رہتی ہیں۔ کیا یہ کوئی قابل اطمینان حالت ہے؟ یہ صرف اخلاق ہی کا سوال نہیں ہے ہماری پوری تہذیب کا سوال ہے۔ مخلوط سوسائٹی جتنی بڑھ رہی ہے عورتوں کے لباس اور بناؤ سنگھار کے

اخراجات بھی بڑھ رہے ہیں۔اس کے لئے جائز آمدنیاں ناکافی ثابت ہورہی ہیں اور رشوت' غبن اور دوسری حرام خوریاں بڑھتی جا رہی ہیں ۔حرام خوریوں نے ہماری ریاست کے پورے نظام کوگھن لگا دیا ہے اور کوئی قانون ٹھیک طرح سے نافذ ہونے ہی نہیں پاتا۔پھر یہ بھی سوچنے کے قابل بات ہے کہ جن کو اپنی خواہشات کے معاملہ میں ڈسپلن کی عادت نہ ہو وہ دوسرے کے معاملے میں ڈسپلن کے پابند کیسے ہو سکتے ہیں۔جو شخص اپنے گھر کی زندگی میں وفادار نہ ہو اُس سے اپنی قوم اور ملک کے معاملہ میں وفاداری کی توقع کہاں تک کی جاسکتی ہے۔

عورت اور مَرد کا دائرۂ عمل الگ کرنا خود فطرت کا تقاضا ہے۔فطرت نے ماں بننے کی خدمت عورت کے سپرد کر کے آپ ہی بتا دیا ہے کہ اس کے کام کی اصل جگہ کہاں ہے اور باپ بننے کا فرض مَرد کے ذمے ڈال کر خود اشارہ کر دیا ہے کہ اسے کن کاموں کے لئے مادری فرائض کے بھاری بوجھ سے سبکدوش کیا گیا ہے۔دونوں قسم کی خدمات کے لئے عورت اور مَرد کو الگ الگ جسم دیا گیا ہے' الگ الگ قوتیں دی گئی ہیں' الگ الگ صفات دی گئی ہیں' الگ الگ نفسیات دیئے گئے ہیں۔فطرت نے جسے ماں بننے کے لئے پیدا کیا ہے اسے صبر و تحمل بخشا ہے' اس کے مزاج میں نرمی پیدا کی ہے' اس کو وہ چیز دی ہے جسے مامتا کہتے ہیں۔وہ ایسی نہ ہوتی تو ہم اور آپ پل کر بخیریت جوان نہ ہو سکتے تھے۔یہ کام جس کے ذمہ ڈالا گیا ہے اس کے لئے وہ کام موزوں نہیں ہیں جن کے لئے سختی اور سخت مزاجی کی ضرورت ہے۔وہ کام اسی کے لئے موزوں ہیں جسے ماں بننے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا ہے اور جسے ان بھاری ذمہ داریوں سے آزاد رکھا گیا ہے جو ماں بننے کا لازمہ ہیں۔

آپ اس تقسیم کو مٹانا چاہتے ہوں تو پھر یہ فیصلہ کر لیجئے کہ اب دنیا کو ماؤں کی ضرورت نہیں ہے۔تھوڑی ہی مدت نہ گزرے گی کہ انسان ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کے بغیر ہی ختم ہو جائے گا۔لیکن اگر یہ فیصلہ بھی آپ نہیں کرتے اور اس تقسیم کو مٹانا چاہتے ہیں تو یہ عورت کے ساتھ بہت بڑی بے انصافی ہے کہ وہ اس پورے بوجھ کو بھی

اٹھائے جو فطرت نے ماں بننے کے سلسلہ میں اس پر ڈالا ہے اور جس میں مَرد ایک رتی برابر بھی اس کے ساتھ کوئی حصّہ نہیں لے سکتا اور پھر وہ مَرد کے ساتھ آ کر سیاست اور تجارت' صنعت اور حرفت اور لڑائی دنگے کے کاموں میں بھی برابر کا حصّہ لے۔

خدا کے لئے ذرا ٹھنڈے دل سے سوچئے! انسانیت کی خدمت میں آدھا حصّہ تو وہ ہے جسے پورے کا پورا عورت سنبھالتی ہے' کوئی مَرد اس میں ذرہ برابر بھی اس کا بوجھ نہیں بٹا سکتا۔ باقی آدھے میں سے آپ کہتے ہیں کہ آدھا بار اس کا بھی عورت اٹھائے۔ گویا تین چوتھائی عورت کے ذمہ پڑا اور مَرد کے ذمہ ایک بٹا چار۔ کیا یہ انصاف ہے؟ عورت بے چاری اس ظلم کو خوشی خوشی برداشت کرنے بلکہ لڑ جھگڑ کر اپنے اوپر لینے کے لئے اس وجہ سے مجبور ہوئی کہ آپ نے عورت ہوتے ہوئے' عورت کی جگہ کام کرتے ہوئے اسے عزت دینے سے انکار کر دیا۔ آپ نے بچوں والی کا مذاق اڑایا' آپ نے گھر گرہستن کو ذلیل قرار دیا۔ آپ نے ان ساری خدمات کو گھٹیا درجہ دیا جو وہ خاندان کے لئے انجام دیتی تھی اور جن کی انجام دہی آپ کی سیاست' معیشت اور جنگ کے لئے بلاواسطہ مفید نہ تھی۔ مجبوراً وہ غریب عزت اور قدر و منزلت کی تلاش میں ان کاموں کے لئے آمادہ ہوئی جو مَرد کے کرنے کے تھے۔ کیونکہ مَرد بنے بغیر اور مَردانہ خدمات انجام دیئے بغیر آپ اسے عزت دینے کو تیار نہ تھے۔ اسلام نے اس پر یہ مہربانی کی تھی کہ عورت رہتے ہوئے اور زنانہ خدمات ہی انجام دیتے ہوئے اس نے اسے پوری عزت مَرد کے برابر بلکہ ماں ہونے کی حیثیت سے مَرد سے کچھ بڑھ کر ہی دی۔ اب آپ کہتے ہیں کہ یہ چیز ''ترقی'' میں حائل ہے۔ آپ کو اصرار ہے کہ عورت ماں بھی بنے اور مجسٹریٹ بھی' اور پھر ناچ گا کر مَردوں کا دل بہلانے کے لئے بھی وقت نکالے۔ آپ اس پر اتنا بوجھ ڈالتے ہیں کہ وہ کسی خدمت کو بھی بخوبی انجام نہیں دے سکتی۔ آپ اسے وہ کام دیتے ہیں جن کے لئے وہ پیدا نہیں کی گئی' آپ اسے اس میدان میں کھینچ لاتے ہیں جہاں وہ مَرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی' جہاں مَرد اس سے آگے ہی رہے گا۔ جہاں عورت کو اگر داد ملے گی بھی تو نسوانیت کی رعایت سے ملے گی یا پھر

کمال کی نہیں بلکہ جمال کی ملے گی۔ یہ آپ کے نزدیک ''ترقی'' کے لئے ضروری ہے۔

گھر اور خاندان جن کی اہمیت کو آپ ''ترقی'' کے جوش میں بھول گئے ہیں' دراصل وہ کارخانے ہیں جہاں انسان تیار ہوتے ہیں۔ یہ کارخانے جوتے اور پستول بنانے کے کارخانوں کی نسبت ترقی کے لئے کچھ کم ضروری تو نہیں ہیں! ان کارخانوں کے لئے جن صفات اور نفسیات اور قابلیتوں کی ضرورت ہے وہ فطرت نے سب سے بڑھ کر عورت کو دی ہیں۔ ان کو چلانے کے لئے جن خدمات اور محنتوں اور مشقتوں کی ضرورت ہے ان کا زیادہ سے زیادہ بوجھ فطرت نے عورت ہی پر ڈالا ہے۔ اور ان کارخانوں میں کرنے کے کام بہت ہیں۔ کوئی فرض شناسی کے ساتھ ان کاموں کو کرنا چاہے جیسا کہ ان کا حق ہے تو اسے سر کھجانے کی مہلت نہ ملے۔ پھر اُن کو جتنی زیادہ قابلیت' سلیقے اور دانش مندی کے ساتھ چلایا جائے اتنے ہی زیادہ اعلیٰ درجہ کے انسان تیار ہو سکتے ہیں اور اس کے لئے عورت کو زیادہ سے زیادہ عمدہ تعلیم و تربیت دینے کی ضرورت ہے۔

ان کارخانوں کو سکون و اطمینان اور اعتماد کے ساتھ چلانے کے لئے اسلام نے پردہ کا ڈسپلن قائم کیا تھا تاکہ عورت یہاں پوری دل جمعی کے ساتھ اپنا کام کر سکے' عورت کی توجہ غلط سمتوں میں نہ بٹے اور مَرد بھی پوری طرح مطمئن ہو کر زندگی کے اس شعبہ کو اُس کے ہاتھوں میں چھوڑ دے۔ اب آپ ''ترقی'' کی خاطر اس ڈسپلن کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے ختم ہو جانے کے بعد دو کاموں میں سے ایک کام آپ کو بہر حال کرنا ہوگا' یا تو عورت کو ہندو تہذیب اور پرانی عیسائی و یہودی تہذیب کی پیروی کر کے غلام بنا دیجئے تاکہ خاندانی نظام بکھرنے نہ پائے' یا پھر اس کے لئے تیار ہو جایئے کہ انسان بنانے کے کارخانے تباہ و برباد ہو کر جوتے اور پستول بنانے کے کارخانے آباد ہوں۔ میں آپ سے صاف کہتی ہوں کہ اس بات کا کوئی امکان نہیں ہے کہ اسلام جو مکمل قانونی اور معاشی حقوق عورت کو دیتا ہے انہیں برقرار رکھتے ہوئے آپ اسلام کے بنائے ہوئے ڈسپلن کو توڑ دیں اور پھر آپ کا خاندانی نظام برباد ہونے

سے بچارہ جائے۔ ترقی کا جو معیار بھی آپ کے سامنے ہو اسے نگاہ میں رکھ کر طے کر لیجئے کہ آپ کیا کھونا چاہتے ہیں اور کیا پانا چاہتے ہیں۔

''ترقی'' بہت وسیع لفظ ہے' اس کا کوئی ایک ہی مقرر مفہوم نہیں ہے۔ مسلمان ایک زمانے میں خلیج بنگال سے لے کر اٹلانٹک تک حکمران رہے ہیں۔ سائنس اور فلسفے میں وہ دنیا کے استاد تھے۔ تہذیب وتمدن میں کوئی دوسری قوم ان کی ہمسر نہ تھی۔ معلوم نہیں کہ اس چیز کا نام کسی کی لغت میں ترقی ہے یا نہیں۔ اگر یہ ترقی تھی تو میں عرض کروں گی کہ یہ ترقی اس معاشرہ نے کی تھی جس میں پردہ کا رواج تھا۔ اسلامی تاریخ بڑے بڑے اولیاء' مدبرین' علماء' حکماء اور مصنفین وفاتحین کے ناموں سے بھری پڑی ہے۔ یہ عظیم الشان لوگ جاہل ماؤں کی گودوں میں پل کر تو نہیں نکلے تھے۔ خود عورتوں میں بھی بڑی بڑی عالمہ اور فاضلہ خواتین کے نام ہم کو اسلامی تاریخ میں ملتے ہیں۔ وہ علوم وفنون اور ادب میں کمال رکھتی تھیں۔ پردہ نے اس ترقی سے مسلمانوں کو نہیں روکا تھا اور آج بھی اسی طرز کی ترقی ہم کرنا چاہیں تو پردہ ہمیں اس سے نہیں روکتا۔ ہاں البتہ اگر کسی کے نزدیک ترقی بس وہی ہے جو اہل مغرب کی ہے تو بلاشبہ اس میں پردہ بری طرح حائل ہے۔ پردے کے ساتھ وہ ترقی ہمیں یقیناً حاصل نہیں ہوسکتی۔ مگر یہ بات نہ بھول جایئے کہ مغرب نے یہ ترقی اخلاقی اور خاندانی نظام کو خطرہ میں ڈال کر کی ہے۔ وہ عورت کو اس کے دائرہ عمل سے نکال کر مَرد کے دائرہ عمل میں لے آیا ہے۔ اس طرح اس نے اپنے دفتر اور کارخانے چلانے کے لئے دوگنے ہاتھ تو حاصل کر لئے اور بظاہر بڑی ترقی کر لی مگر گھر اور خاندان کا سکون کھو دیا۔ آج بھی اگر وہاں گھر آباد ہیں تو صرف گھر گرہستن عورتوں کی بدولت۔ مَردوں کے ساتھ کمانے والی عورتیں کہیں بھی گھر کا نظام نہیں چلا رہیں' اور نہ چلا سکتی ہیں۔ ان کے نکاح طلاقوں پر ختم ہو رہے ہیں' ان کے بچے تباہ ہو رہے ہیں' ان کے لئے ٹھکانا اگر ہے تو کلب میں یا ہوٹل میں' گھر ان کے لئے سکون کی جنت نہیں رہے۔ اور اپنی جگہ لینے کے لئے بہتر انسان تیار کرنے کا کام انہوں نے چھوڑ دیا۔ اس ترقی پر کوئی ریجھتا ہے تو ریجھے !